جہاں کچھ درد کا مذکور ہوگا
ہمارا شعر بھی مشہور ہوگا
(جرأت)

جرأت

اُن کا

عہد اور عشقیہ شاعری

از

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

اُردو مرکز
گنپت روڈ، لاہور

اُردو اکیڈمی سندھ
بندر روڈ، کراچی

مطبوعہ: [illegible] پریس، کراچی

کتابت — شہامت احمد دہلوی

پہلی بار — [illegible] ۱۹۵۲ء

قیمت دو روپے

تعارف

اردو غزل کی تاریخ بیان کی جاتی ہے تو سلطان محمد قلی قطب شاہ، ولی، حاتم مرزا مظہر، خانِ آرزو، سودا، میر، میر درد، میر حسن، مصحفی اور انشا کے نام متقدمین میں گنائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا کلام بار بار چھپا ہے لیکن تحقیق و تنقید کے جدید معیار پر وہ بھی پورا نہیں اترتا۔ بعض کا کلام ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔
آبِ حیات لکھتے وقت مولانا آزاد کو شکایت تھی کہ میر حسن نے ہزاروں شعر کہے لیکن اس وقت دس غزلیں بھی نہ ملیں جو آبِ حیات میں شامل کی جاسکتیں، مصحفی کا کلام اب تک نایاب ہے جرأت کا کلام کچھ چھپا ہے کچھ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔
لیکن اردو شاعری بالخصوص غزل کا مطالعہ اس وقت تک ناقص اور نامکمل رہیگا جب تک ان اساتذہ کا کم از کم منتخب کلام، ان کے عہد اور ماحول کے پس منظر اور تنقید کے ساتھ شائع نہیں ہو جاتا۔ اس سلسلے میں مصحفی کے نادر اور نایاب کلام کا انتخاب اور اس پر تبصرہ شائع ہو چکا ہے میر حسن کے غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب اور تنقید زیر طبع ہے۔ جرأت کے عہد پر ایک مفصل تاریخی تبصرہ اور ان کے شاعرانہ کمال کا جائزہ اس انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ حاضر ہے۔ تاریخی تبصرہ کسی قدر طویل ہے لیکن ہمارے علم میں اب تک اٹھارہویں صدی کے [illegible] کے سماجی اور تاریخی پس منظر کو مناسب تفصیل کے ساتھ پیش نہیں کیا

گیا ہے جس کے بغیر اس عہد کی شاعری کا مطالعہ نامکمّل رہ جاتا ہے۔ اِسی لئے اسے بغیر کسی معذرت کے شائع کیا جاتا ہے۔

ابواللّیث صدّیقی

لاہور
اگست سنہ ۱۹۵۰ء

اٹھارہویں صدی عیسوی
کا
سیاسی اور سماجی ماحول

بسم اللہ

جرأت کے والد نادری حملے (۱۷۳۹ء) میں مارے گئے۔ یہ زمانہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (سنہ ۱۷۰۷ء) کے صرف بتّیس سال بعد کا ہے لیکن یہ مختصر سی مدّت ہندوستان کی سیاسی اور ذہنی تاریخ میں اپنے واقعات اور اُن کے نتائج کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ جس سلطنت کو بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی مسلسل جدّ و جہد نے اس وقت ایشیا کی سب سے قوی اور دولتمند ریاست بنا دیا تھا اور جس کے استحکام کے لیئے اورنگ زیب نے اپنی تمام قوّت صَرف کر دی، وہ اس کے مرتے ہی ایسی عمارت کی طرح بیٹھ گئی جس کی بنیادیں ریت پر رکھی گئی ہوں۔ اس مختصر سے عرصے میں سلطنت دہلی کا شیرازہ منتشر ہو گیا صوبوں نے خود مختاری کا اعلان کیا اور رفتہ رفتہ ایک مضبوط مرکزی حکومت کی جگہ طول و عرض میں چھوٹی بڑی ریاستیں پیدا ہو گئیں جو عملاً خود مختاری کی دعویدار تھیں۔ ان میں سے بعض کا رقبہ اور وسائل نہایت محدود تھے۔ اس لیئے ان کا حلقۂ اثر بھی محدود تھا لیکن بعض ریاستیں اپنی وسعت، مالیات اور سیاسی اثر کی بنا پر واقعی سلطنتوں کے درجہ تک پہنچ گئیں، یہ سارا عمل دس بیس سال کی مدت میں مکمل نہیں ہو گیا لیکن اس کے آثار نہایت صاف اور واضح ہو چلے تھے محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کے بعد کوئی بیرونی صدمہ ایسا نہ گزرا تھا جو قابلِ ذکر ہو۔ مغلوں نے اپنی جدّ و جہد سے ایک نئی سلطنت قائم کی، لیکن وہ کچھ بیہیا

رہ گئے اور جس خاک میں اُن کے باپ دادا پیوندِ زمین ہوئے اُسی سے انکی نئی نسلیں پروان چڑھیں۔ نادرشاہ کے حملے تک مغلوں کی حکومت گویا مُلکی حکومت تھی، نادر کے آنے سے مدّت کے بعد گویا پہلی مرتبہ لوگوں کو پھر ایک بیرونی حملہ کا احساس ہوا اور یہ احساس ایسا شدید تھا کہ اس نے لوگوں کی زندگی کا رُخ اور ان کی تہذیب و معاشرت کا انداز بدل دیا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ زندگی جو اپنی ہر کروٹ سے شعر و ادب کو متاثر کرتی ہے اس دور کے شعرا اور انکے کلام پر کس طرح اثرانداز ہوئی ہے۔ دکن سے قطع نظر شمالی ہند میں حاتم، آبرو، مضمون، شاکر ناجی، یکرنگ، خان آرزو، مرزا مظہر، میر تقی، مرزا رفیع السودا، قائم، درد، اثر، میر حسن، انشا، جرأت، مصحفی اور رنگین تک اسی دور میں آتے ہیں۔ اس اعتبار سے اسے اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نہایت اہم دور قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ اس لئے بھی اس عہد کے حالات اور واقعات کا تفصیلی جائزہ لینا اس عہد کے شعر و ادب کے پس منظر کو مرتب کرنے میں ہمیں بڑی مدد دیتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ سنہ ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہوا اسوقت تخت کے تین دعویدار تھے، محمد معظم (ولادت ۱۰۵۳ھ / ۱۶۴۳ء) محمد اعظم (ولادت ۱۰۶۳ھ / ۱۶۵۳ء) اور محمد کام بخش (ولادت ۱۰۷۷ھ / ۱۶۷۷ء) عالمگیر کی وصیت یہ تھی کہ ممالک کے بیس صوبوں میں سے بہادر شاہ محمد معظم بارہ صوبے، اعظم شاہ چھ صوبے اور کام بخش دو صوبے آپس میں تقسیم کرلیں۔ کام بخش کے لیئے دکن کے صوبے، مالوہ اور احمد آباد، گجرات تجویز ہوئے تھے۔ آگرہ اور دلّی میں سے ایک ایک شہر باقی دونوں شہزادوں کے حصّہ میں آتا تھا، لیکن ہوس ملک گیری نے کہ دو سلطان ایک اقلیم میں نہیں سما سکتے، اس وصیت پر عمل نہ ہونے دیا، اور تینوں شہزادوں نے

اپنے اپنے حق کا فیصلہ اپنی قوّتِ شمشیر سے کرنا چاہا، تختِ دہلی کے لئے کشت و خون کا یہ ایسا سلسلہ تھا جس نے اگلے چند سال میں کتنوں کی جانیں لیں اور کتنوں کو قید و بند کی المناک زندگی نصیب کی۔ پہلے اعظم اور معظم میں معرکہ ہوا اور اعظم اس معرکہ میں کام آیا۔ مورخین کی روایت کی مطابق اعظم کے کم از کم دس بارہ ہزار سوار بھی میدان میں مارے گئے۔ اس کے بعد کام بخش سے مقابلہ ہوا، اور اس کا بھی یہی انجام ہوا، آخری فیصلہ کُن لڑائی ۱۳ جنوری سنہ ۱۷۰۹ء کو ہوئی گویا اورنگ زیب کی جانشینی کا جھگڑا کم و بیش دو سال کی مدت میں جا کر طے ہوا۔

اِدھر تخت و حکومت کے لئے بھائی کا بھائی خون بہا رہا تھا اُدھر سلطنت کے گوشوں میں وہ دشمن جنھیں آلِ تیمور نے اپنی قوّت یا پھر اپنے تدبّر اور حسنِ سلوک سے اپنا دوست بنا لیا تھا اس کمزوری سے واقف ہو کر موقع کی تلاش میں تھے کہ آزاد اور خود مختار ہو جائیں۔ اورنگ زیب کو دکن کی فوج کشی اس اعتبار سے بڑی مہنگی پڑی تھی، بے شمار آزمودہ کار سردار اور سپاہی مارے گئے تھے سلطنت کا خزانہ جس میں شاہ جہاں کے عہد میں سولہ کروڑ کی رقم تھی، آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا تھا، جن شہریوں کے اعزّا اور اقربا اس مہم میں شریک تھے اُنکی طویل جدائی نے عوام میں بددلی بلکہ بے چینی پھیلا دی تھی۔ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور راجپوتوں نے آپس کے شدید اختلافات کے باوجود ایک طرح کا متحدہ محاذ بنا لیا تھا۔ مقصد ان سب کا ایک تھا، سلطنت مغلیہ کے شیرازہ کو درہم برہم کرنا، یہ کوششیں بہ یک وقت ملک کے اتنے مختلف گوشوں سے شروع ہوئیں کہ ایک طاقتور حکومت کے لئے بھی ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ پھر یہاں تو سلطنت کو گھن لگ چکا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ قحط الرّجال تھا۔ بقول ایک مورخ[1] کے جو لوگ محفل سے اٹھ

---

[1] NADIR SHAH IN INDIA - Sarkar - P 2

ئے تھے ان کی جگہ خالی تھی۔ عبدالرحیم خانخاناں، مہابت خاں، سعداللہ، میرجملہ اسلام خاں اور اُن کے ساتھیوں نے سترہویں صدی کی تاریخ کی تشکیل کی۔ لیکن ان کی اولاد میں ایک بھی ایسا نہ نکلا جو ان کے کارناموں میں اضافہ تو درکنار اُن کی کمائی ہوئی دولت اور اُن کے خون سے حاصل کی ہوئی شہرت اور نیک نامی کو برقرار رکھ سکتا۔ یہ قحط الرّجال صرف سیاسی نقطۂ نظر سے ہی قابل غور نہیں، تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں اس سے جو خلا پیدا ہوا اس کا پُر کرنا بھی آسان بات نہ تھی۔

ان حالات میں خودغرضی، سازش، ساز باز اور جتھہ بندی ایک قدرتی امر تھا۔ اُمرا مختلف جتھوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر شاہزادہ تخت کا دعویدار تھا اور کسی وقت بھی تلوار فیصلہ کے لئے نیام سے نکالی جاسکتی تھی۔ اسی لئے جب کوئی امیر یا وزیر کسی شاہزادے کی رفاقت اختیار کرتا تو بالعموم اس کا یہی مقصد ہوتا کہ حصول تخت وتاج کے بعد وہ حکومت میں پورا عمل دخل حاصل کرسکے گا۔ اسی لئے وہ کسی جائز یا ناجائز ذریعہ کے استعمال میں تامّل نہ کرتا، گویا تخت کے لئے جنگ صرف شاہزادوں تک محدود نہ تھی، ہر امیر اور وزیر کے لیے یہ ایک ذاتی مسئلہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

بہادر شاہ کی وفات ۲۷ فروری سنہ ۱۷۱۲ء کو ہوئی۔ تخت کے لیے تنازعہ اس کا دم نکلنے سے پہلے شروع ہوچکا تھا۔ اور اگر ہم مورخین کے بیان[ا] کو تسلیم کرلیں تو چار بیٹوں کے ہوتے ہوئے جس وقت اس کا دم نکلا وہ تنہا تھا اور جس سلطنت کے حاصل کرنے کے لئے اس نے کتنے میدانوں کو گنج شہیداں بنایا تھا اور دو بھائیوں کا خون اپنے نامۂ اعمال میں لکھوایا تھا اس تخت وتاج

[ا] IRVIN_LATER MOGHALS Vol. I

نے اس سے وفا نہ کی بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اس جھگڑے میں جو تخت کے
دعوے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا کسی کو تجہیز و تکفین کی طرف توجہ نہ ہوئی اور وفات کے
بعد ایک مہینہ تک لاش لاہور میں پڑی رہی اور پھر دفن ہونے کے لئے دہلی بھیجی
گئی۔ محمد ہادی کامور خان لکھتا ہے لہ

"وفات کی خبر سنتے ہی شاہی لشکر میں ابتری پھیل گئی اور ہر طرف شور و
غوغا بلند ہوا۔ اُمرا اور سرکاری عہدہ دار رات کی تاریکی میں اپنے خیموں سے باہر
نکل گئے تاکہ کسی ایک شہزادے کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ بعض لوگ ایسے تھے جو
کسی جتھے یا گروہ سے تعلق نہ رکھتے تھے، ان میں کچھ سپاہی بھی تھے اور ان سب پر بڑی
سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ کیوں کہ ان میں سے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انکی قسمت
میں کیا لکھا ہے، یہ لوگ اپنے اہل و عیال کو لیکر شہر میں پناہ لینے کے لئے چلے گئے
چوروں، اُچکّوں کی بن آئی اور آزادی سے انھوں نے لُوٹ مار شروع کر دی بازاروں
پر ایسی بھیڑ ہو گئی کہ راستہ چلنا دشوار تھا اور لوگوں کو مکانوں میں بھی پناہ کی جگہ نہیں
ملتی تھی۔ لوگ گھبرا کر دوکانوں میں لگے تھے۔ عزیز اور رشتے دار بھی اپنے اقربا کو
پناہ نہ دے سکتے تھے۔ شہزادوں کے لشکروں میں سخت بے چینی تھی اور امرا میں سے
کسی کو اپنی زندگی کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ سپاہیوں نے اپنی تنخواہوں کا مطالبہ شروع
کیا اور اس سلسلہ میں سخت ہنگامہ ہوا، اور دوسرے شاہی ملازمین بھی اُن کے
ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ لوگ گالی گلوچ کرتے اور ہر طرف لوٹ مار کرتے پھرتے تھے
نہ باپ اپنے بیٹوں کو بچا سکتے تھے اور نہ بیٹے اپنے والدین کو پناہ دے سکتے تھے۔ ہر شخص
اپنے حال میں ایسا گرفتار تھا کہ بالکل قیامت کا دن معلوم ہوتا تھا"

اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ دلّی میں طوائف الملوکی

لہ تاریخ سلطانی بحوالہ تاریخ سدا لیبن حصہ ہشتم صفحہ 19

دور دورہ شروع ہو چکا تھا جس میں کسی کا مستقبل یقینی نہیں تھا۔ بہرحال بہادر شاہ کے بیٹوں میں قسمت نے جہاں دار شاہ کا ساتھ دیا جو ۲۱ صفر سنہ ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) کو تخت پر بیٹھا، اور اُس کے عہد سے زوالِ سلطنت کے وہ آثار ظاہر ہونے لگے جو محمد شاہ کے عہد تک اپنی انتہا کو پہنچ گئے۔ اس کے زمانہ میں مہینے میں تین مرتبہ دہلی میں چراغاں ہوتا تھا اور جس مقدار میں چراغاں کی ان تقریبات میں روغن صرف ہوتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی قیمت دو روپے سیر ہو گئی جو اس عہد کی رائج قیمتوں کے حساب سے نہایت غیر معمولی ہے۔ جب تیل کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو گھی کا استعمال ہونے لگا، یہاں تک کہ وہ بھی ختم ہو کر ناپید ہو گیا اور کھانا تو در کنار لوگوں کو دوا کے لئے بھی دستیاب ہونا دُشوار ہو گیا۔ ایسے وقت میں جب خزانہ خالی ہو چکا تھا، سپاہیوں کی تنخواہوں کے مطالبے بقایا تھے شہنشاہ کا یہ اسراف اُس کی تباہی کے ساتھ عوام کی مفلوک الحالی کا بھی باعث بن رہا تھا۔
اس وقت امورِ سلطنت اور خود جہاں دار شاہ کی زندگی میں لال کنور کا دخل عمل ایسا بڑھا تھا جس کی مثال اس سے پہلے صرف نور جہاں میں ملتی ہے۔ لیکن کردار کی جو خوبیاں اور مکمل تہذیب و شائستگی کی جو تصویر نور جہاں کے یہاں ملتی تھی لال کنور اس سے یکسر محروم تھی، وہ ایک ادنیٰ درجہ کی عورت تھی اور باوجود شہنشاہ کا قرب حاصل ہونے کے اس نے کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا، جو لوگ محمد شاہ کو رنگیلا، اور واجد علی شاہ کو راجہ اندر بتاتے ہیں وہ جہاں دار کی اس داشتہ کے حالات سُن کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اس کا عالم یہ تھا کہ ایک روز جہاں دار شاہ کے ساتھ ثمن برج میں بیٹھی جمنا کی سیر دیکھ رہی تھی کہ ایک کشتی سامان اور مسافروں سے لدی ہوئی گزری۔ لال کنور بولی میں نے آج تک اپنی آنکھوں کے سامنے کوئی کشتی دریا میں ڈوبتے نہیں دیکھی آج یہ تماشہ بھی دیکھنا چاہیئے۔ یہاں صرف اشارہ کی دیر تھی،

ملاحوں کو حکم ہوا کہ کشتی ڈبو دیجائے اور اس طرح لال کنور کے ایک احمقانہ جذبہ کی تسکین کے لئے کتنے ہی بیگناہ انسانوں کو بھینٹ چڑھا دیا گیا۔[۱] اس سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ سیاسی افراتفری کے اس دور میں انسانی زندگی کیسی سستی ہو گئی تھی۔ اگر ان حالات میں اس عہد کے شعرا اور مصنفین نے بار بار انسان کی زندگی کی بے قدری کا رونا رویا ہے تو تعجب کی کوئی بات نہیں

نااہلوں کو اس عہد سے جو فروغ حاصل ہونا شروع ہوا اور جس کے بیان سے ہمارے شعرا میں حاتم، سودا اور دوسرے لوگوں کے نسبر آشوب بھرے پڑے ہیں اس کی مثال پہلے کہیں نہیں ملتی۔ لال کنور کے بھائی برادر رشتہ دار سب ڈوم، میراثی اور دھاڑی تھے۔ لال کنور کو امتیاز محل کا لقب اور وہ تمام دولت بخشدی گئی جو جہاں دار شاہ نے اپنے مرحوم بھائیوں عظیم الشان اور جہاں شاہ کے لشکروں سے ضبط کی تھی، بادشاہ کی نظر کرم صرف اپنی محبوبہ کی ذات تک محدود تھی، اس کے باپ اور بھائیوں کو سلطنت میں اعلیٰ مراتب و مناصب پر فائز کیا گیا۔ انھیں امرا کی طرح اپنے دروازوں پر نوبت نقارہ رکھوانے کی اجازت دی گئی اور جب وہ راستہ سے گزرتے تھے تو شاہی سواری کی طرح ان کے آگے آگے نوبت بجتی جاتی تھی۔ اس کے تین بھائیوں کو نعمت خاں، نامدار خاں اور خانہ زاد خاں کے خطاب دیئے گئے۔ شہر کے امرا اور شرفا میں سے جنکے محلات انکو پسند آئے ضبط کر کے بخشدیئے گئے۔ مشہور مورخ ہادی کامدار خاں ان حالات کو دیکھ کر کہتا ہے کہ "اب وہ زمانہ آگیا کہ باز کے آشیانہ میں چغد آباد ہے اور بلبل کی جگہ زاغ نے لے لی ہے"۔ یہ لوگ شہر اور شہر والوں کے لئے ایک بلا اور مصیبت بن گئے تھے۔ بازاروں اور گلیوں میں اتراتے پھرتے تھے اور جس پر چاہتے ظلم کر لیتے کسی

---

[۱] LATER MOGHALS Vol I P 192

کو احتساب کی مجال نہ تھی۔ اس زمانہ کا ایک اور تاریخی واقعہ قابلِ ذکر ہے :۔
نعمت خاں کلاونت مذکور کو ملتان کی صوبہ داری پر مقرر کیا گیا۔ جہاں دار شاہ نے اس کی منظوری دے دی اور اپنے وزیر کو ضروری احکام صادر کرنے کی ہدایت کی، اس وقت ذوالفقار خاں وزیر تھے، انھوں نے احکام سلطانی کی تعمیل میں کچھ دیر کی، اور جب نعمت خاں نے اس باب میں اُن سے استفسار کیا تو ذوالفقار خاں نے جواب دیا کہ دستور کے مطابق ایسے مواقع پر وزیر کو پہلے تحفہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ چناں چہ پہلے ایک ہزار دستار کا تحفہ ملنا چاہیئے، اس کے بعد منصب داری کی سند جاری ہو جائے گی۔ نعمت خاں اس قدر جاہل تھا کہ ذوالفقار خاں کے اس طنز کو نہ سمجھ سکا اور دو سو دستار اس کی خدمت میں پیش کر دیئے لیکن ذوالفقار خاں کو اس پر اصرار تھا کہ ایک ہزار کی تعداد پوری کی جائے، نعمت خاں نے آخر مجبور ہو کر جہاں پناہ کی خدمت میں شکایت پیش کی۔ جہاں دار شاہ نے ذوالفقار خاں کو بلا کر دریافت کیا کہ آخر اتنے دستار جمع کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ اس نے جواب دیا کہ جب ظلِ سبحانی نے گویوں اور ڈھاڑیوں کو صوبوں کی صوبہ داری اور حکومت کے اعلیٰ عہدے بخشنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اُمرا اور شرفا کے لیئے سوائے اس کے اور کیا چارہ رہ گیا ہے کہ وہ تلوار اور سپر اُتار کر رکھ دیں اور سارنگ نوازی اختیار کر لیں چناں چہ انھیں کے لئے یہ دستار جمع کر رہا ہوں۔

لال کنور کی ایک سہیلی زہرہ نام تھی جو سبزی فروش تھی۔ لال کنور کے اقبال کا سایہ اس پر پڑا تو اسے بھی ہما گیر مل گئی۔ اس کی بدتمیزی کا یہ حال تھا کہ چین قلیچ خاں نظام الملک ایک روز اپنی پالکی میں سوار بازار سے گزر رہے تھے، عین اسی وقت زہرہ کی سواری گزری، وہ ہاتھی پر سوار تھی اور ملازمین

کی ایک فوج اُس کے ہمراہ تھی۔ قلیچ خاں کے مختصر سے عملہ کو راستہ سے ہٹا دیا گیا اور جب زہرہ اس کے قریب سے گزری تو بولی کیا یہ وہی اندھے کا بیٹا ہے۔ اس پھبتی کا اشارہ غازی الدین خاں فیروز جنگ کی طرف تھا جو چین قلیچ خاں کے والد اور ایک مشہور فوجی سردار تھے۔ اس بدتمیزی پر چین قلیچ خاں کے ملازمین نے زہرہ کو کھینچ کر ہاتھی پر سے اُتار لیا اور سخت سرزنش کی۔ لال کنور نے شہنشاہ سے شکایت کی۔ شہنشاہ نے بجائے اس بدتمیزی پر اظہار ناراضگی کے ذوالفقار خاں کو حکم دیا کہ لال کنور کی مرضی کے مطابق قلیچ خاں پر تنبیہ کی جائے۔ ذوالفقار خاں نے بادشاہ سلامت سے عرض کیا کہ اگر لال کنور کے احکام کی تعمیل کی گئی تو تمام اُمرا میں سخت بے چینی اور غم و غصہ کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ چناں چہ جہاں دار شاہ امرا یا شرفا کی عزت کو بچانے کے لئے نہیں بلکہ خود کو خطرے سے بچانے کے لیے اس سے معذور رہا۔ لیکن اس ایک واقعہ سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہوا کا رُخ کس طرف تھا اور کیسا زمانہ آنے والا تھا۔

جہاں دار شاہ اور لال کنور نے شہنشاہی کے رہے سہے وقار اور رکھ رکھاؤ کو بھی کھو دیا۔ لال کنور کے اصرار پر شہنشاہ اس کے ساتھ ایک معمولی رتھ میں سوار ہو کر بازار کی سیر کو جاتے اور خرید و فروخت کرتے۔ بات دراصل یہ تھی کہ شاہی محلسرا میں داخل ہونے کے باوجود لال کنور اپنی اصلیت پر باقی تھی۔ ایک مرتبہ دونوں اسی رتھ میں دن بھر باغات کی سیر کرتے پھرے۔ واپسی میں دونوں لال کنور کی ایک سہیلی کے مکان پر پہنچے جو شراب کی بھٹی رکھتی تھی۔ یہاں دونوں نے اس قدر شراب پی کہ بے ہوش ہو گئے۔ جب دونوں وہاں سے رخصت ہونے لگے تو علاوہ انعام و اکرام کے اسے مستقل جاگیر بھی بخشی گئی۔ اس کے بعد دونوں محل میں واپس آنے کے لیے روانہ ہوئے اور راستہ میں ہی رتھ میں سو گئے۔ جب محل کے دروازے پر پہنچے تو لال کنور

کی خادماؤں نے اسے خواب یا بے ہوشی کی حالت میں رتھ میں سے نکال لیا ، اور شہنشاہ اسی حالت میں پڑے رہے ۔ رتھ چلانے والا خود بھی نشہ میں تھا ، اس نے بھی نہ دیکھا اور رتھ لے کر واپس چلا گیا ۔ جب بہت دیر ہو گئی تو ملازمین سلطانی کو تردّد ہوا ، محل میں دیکھا تو شہنشاہ کا پتہ نہ چلا ۔ لال کنور کے پاس تلاش کیا وہاں بھی نہ ملا ۔ وہاں یہ معلوم ہوا کہ رتھ میں دیکھنا چاہیئے ۔ چنانچہ تلاش ہوئی تو محلسرا سے دو میل دُور جہاں دار شاہ رتھ میں بے ہوش پڑے تھے ۔

دلّی میں حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کے مزار سے ملحق ایک باولی ہے ۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جو شخص اولاد سے محروم ہو ، اگر چالیس یک شنبوں تک متواتر اس باولی میں غسل کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ضرور اولاد بخشتا ہے چنانچہ لال کنور کے اصرار پر جہاں دار شاہ اور لال کنور دونوں ننگے ہو کر ایک ساتھ اس باولی میں نہاتے تھے اور اس طرح شہنشاہ کی ذات کے ساتھ وابستہ رہے سہے وقار کو مٹاتے تھے ۔ ایسی ایک ڈھلوان چٹان تھی جس پر شہر کے آوارہ اور کوچہ گرد لڑکے پھسلا کرتے تھے ، جہاں دار شاہ نے دیکھا تو امنگ آئی کہ ہم بھی ایسا کریں چناں چہ اُمنگ نے فوراً عمل کا جامہ پہن لیا ۔ یہ واضح رہے کہ اس وقت اسکی عُمر پچاس سال سے متجاوز تھی ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس سلطانی جلسۂ نشاط میں تبدیل ہو گئی ۔ رات ہوتے ہی ادنیٰ درجہ کے گویّے اور ڈوم جو زیادہ تر لال کنور کے رشتہ دار تھے ، محل میں جمع ہو جاتے اور شہنشاہ کے ساتھ مجلس مے نوشی میں شریک ہوتے ۔ بدمستی کے عالم میں یہ لوگ گالی گلوچ اور ہاتھا پائی کرتے اور جہاں دار شاہ کو اپنی ان حرکتوں میں شریک کرتے یہ وہی جہاں دار شاہ تھا جو اس اورنگ زیب عالمگیر کا پوتا تھا جو صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا اور قرآن پاک کی کتابت کرکے رزق حلال کھاتا تھا ۔ یہ اس المیہ کا آغاز تھا

جس کا انجام بڑا عبرتناک ہونے والا تھا۔ "النّاس علیٰ دین ملوکہم" بادشاہ کا یہ حال تھا تو عوام کا کیا رنگ ہوا ہوگا اور یہ سب اس وقت ہو رہا تھا جب ہر طرف سے آہستہ آہستہ بلاؤں کا ہجوم ہو رہا ہے جیسے طوفان سے پہلے آسمان پر سیاہ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جمع ہونے لگتے ہیں یہاں تک کہ سارا مطلع تاریک ہو جاتا ہے اور پھر یکایک طوفان اُمنڈ پڑتا ہے ویسے ہی آثار پایہ تخت میں پیدا ہو چلے تھے۔

جو کچھ جہاں دارشاہ کے ہاتھوں اس کے بھائیوں پر گزرا تھا وہی قدرت نے خود اس کے لئے مقسوم کر رکھا تھا اور اس کے لئے تقدیر نے فرخ سیر کو اپنا آلہ کار بنایا۔ بہادر شاہ کے عہد میں فرخ سیر مرشد آباد میں تھا اور اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق اس کی مدد کے لئے وہاں سے روانہ ہو کر عظیم آباد پٹنہ تک پہنچا تھا کہ ۷ صفر سنہ $\frac{\text{١١٢٤ھ}}{\text{١٧١٢ء}}$ کو اسے بہادر شاہ کی وفات کی خبر ملی، یہ سنکر اس نے اپنے والد عظیم الشان کے نام کا خطبہ پڑھا اور سکّہ جاری کیا۔ لیکن بائیس روز بعد سے اپنے والد کی شکست اور انتقال کی خبر ملی۔ اس خبر سے فرخ سیر کو ایسا صدمہ ہوا کہ اس کے صلاح کاروں نے اگر ہمت نہ بندھائی ہوتی تو وہ خودکشی کر لیتا اس کے بعد اس کی ماں نے غیرت دلا کر میدانِ جنگ میں اپنی قسمت کا فیصلہ اور باپ کے خون کا بدلہ لینے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ فرخ سیر نے اپنے نام کا خطبہ پڑھا اور سکّہ جاری کرنے کا حکم دیا۔ فرخ سیر نے دربار کے ان تمام اُمراء سے امداد طلب کی جو اس کے مرحوم والد کے رفیق تھے اور انہی کی بدولت اعلیٰ منصب پر پہنچے تھے۔ لیکن خود غرضی کا یہ عالم تھا کہ سوائے سادات بارہہ کے اور کوئی اس کی مدد کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ فرخ سیر کی والدہ اپنی چھوٹی لڑکی کو لیکر حسین علی خاں کی والدہ کے پاس گئی۔ ان دونوں نے اس سیدہ کی بڑی منت سماجت کی اور

آخرکار اپنی والدہ کی سفارش پر حسین علی خاں نے فرخ سیر کا ساتھ دینے کا وعدہ کرلیا۔ اس کا دوسرا بھائی عبداللہ خاں تھا وہ بھی اس عہد میں شریک ہوگیا اور آخرکار جہاں دارشاہ کو لال کنور کی صحبت اور محفلِ عیش ونشاط سے نکل کر میدان میں آنا پڑا۔ وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا اور جو کچھ جہاں دارشاہ کے باب میں مذکور ہوا اس سے لوگوں میں ہمدردی کا جذبہ مُردہ ہوچکا تھا۔ جہاں دارشاہ کا اقبال شہابِ ثاقب کی طرح تھا کہ چمکا اور مٹ گیا، جس قدر معرکے اس سلسلے میں ہوئے ان کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن آخرکار فتح فرخ سیر کے ہاتھ رہی۔ یہ فیصلہ کُن لڑائی آگرہ میں ۱۳ ذی الحجہ سنہ ۲۴ ۱۱ھ ۱۷۱۳ء کو ہوئی۔ جہاں دارشاہ جس کو شراب نوشی کی کثرت اور گویّوں کی صحبت نے بالکل ناکارہ بنا دیا تھا، میدان سے جان بچاکر بھاگا اور تبدیلِ ہیئت کے لئے کہ راستہ میں اسے کوئی پہچان نہ لے۔ اُس نے اپنا شاہی لباس اُتار ڈالا۔ داڑھی مونچھ صاف کرائی اور ایک معمولی بہلی میں لال کنور اور صرف ایک رفیق کے ساتھ دہلی پہنچا، راستہ میں بڑی مصیبت اُٹھاتا وہ ۱۸ ذی الحجہ کو دہلی میں داخل ہوا اور اسد خاں آصف الدولہ کے مکان پر پہنچا۔ یہاں بھی اسے پناہ نہ ملی۔ فرخ سیر کے طرفداروں کو پتہ چل گیا کہ جہاں دارشاہ اسد خاں کے گھر میں چُھپا ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جمع ہوکر اسد خاں سے مطالبہ کیا کہ جہاں دارشاہ کو ان کے حوالہ کردیا جائے۔ آخرکار مجبور ہوکر جہاں دارشاہ کو ان کے حوالے کرنا پڑا اور اسے لال کنور کے ساتھ قید میں ڈال دیا گیا۔ فرخ سیر کے دلّی میں داخل ہونے سے پہلے ہی دلّی کی جامع مسجد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ جہاں دارشاہ نے تقریباً تین ہفتے قید خانہ میں گزارے تھے کہ فرخ سیر کے دستخط خاص سے اس کا آخری فیصلہ کرنے کا حکم پہنچ گیا۔ جب سپاہی قید خانے میں داخل ہوئے تو لال کنور ڈر سے چیخ اُٹھی اور

جہاں دارشاہ سے لپٹ گئی۔ دونوں کو زبردستی الگ کیا گیا۔ اس کے بعد سپاہیوں نے گلا گھونٹ کر جہاں دارشاہ کو مار ڈالا اور یہ یقین کرنے کے لئے کہ زندہ نہ رہ جائے ایک مغل سپاہی بھاری قوی جو۔تے پہنکر اس کے سینہ پر کھڑا ہو گیا اور ٹھوکریں مار مار کر اس کی پسلیاں توڑ ڈالیں۔ پھر اس کا سر قلم کیا گیا جسے ایک دسترخوان پر رکھ کر اور باقی جسم ایک کھلے سیانے میں ڈال کر نئے شہنشاہ کی خدمت میں بھیجدیا گیا۔ دوسرے دن صبح فرخ سیر دارالخلافہ میں داخل ہوا، وہ ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ عبداللہ خاں پیچھے مورچھل ہلا رہا تھا۔ دوسرے ہاتھی پر جلاد ایک بانس پر جہاں دارشاہ کا سر علم کئے ہوئے سوار تھا۔ جلوس جب شہر پناہ میں داخل ہوا تو لوگوں کا مجمع ہو گیا اور جہاں دار کی حرکتوں کے باوجود بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس نظارہ کی تاب نہ لا سکتے تھے، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور گلوں میں پھانسیں لگ رہی تھیں، وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے "دیکھئے کل تک تھے سردار اور آج ہیں اس مصیبت میں گرفتار۔ فاعتبروا یا اولی الابصار" جہاں دارشاہ اور اس کے وزیر ذوالفقار خاں کی لاشیں محل کے دلی دروازہ کے سامنے والے میدان میں پھینکدی گئیں جہاں وہ تین دن تک اسی حالت میں پڑی رہیں۔ جہاں دارشاہ کے ساتھیوں اور امیروں پر جو گزری ہو گی وہ ظاہر ہے۔ غرض اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد چھ سال (۱۷۱۳ء) کے قلیل عرصہ میں یہ تیسرا خونی انقلاب تھا جسے دلی والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا

جس تخت کو فرخ سیر نے اس قدر خواہش اور جدوجہد سے حاصل کیا تھا، اس پر چین سے بیٹھنا اسے ایک دن بھی نصیب نہ ہو سکا۔ دربار میں سادات بارہہ کا زور بالکل قدرتی امر تھا۔ عبداللہ خاں کو وزیراعظم مقرر کیا گیا اور

ان کا پورا لقب نواب قطب الملک یمین الدولہ سید عبداللہ خاں بہادر ظفر جنگ سپہ سالار یار وفادار قرار پایا۔ سید حسین علی خاں کو بخشی اوّل مقرر کیا گیا اور ان کا لقب عمدۃ الملک امیرالامرا بہادر فیروز جنگ سپہ سردار ہوا۔ ان دونوں کے علاوہ دوسرے ساتھیوں اور ہوا خواہوں کو مناسب عہدے اور منصب بخشے گئے۔ علاوہ اور لوگوں کے بعض سردار ایسے تھے جنھیں اپنے اثر و اقتدار کی بنا، پر امورِ سلطنت میں زیادہ عمل دخل تھا۔ ان میں ایک اعتماد الدولہ محمد امین خاں بہادر نصرت جنگ تھے، جنھیں سید حسین علی خاں کے بعد بخشی دوم بنایا گیا تھا۔ ایک صمصام الدولہ خانِ دوراں بہادر منصور جنگ خواجہ عاصم تھے جو دربار میں ملکی ہندوستانی جماعت کی نمایندگی کرتے تھے۔ ان سب کے علاوہ عبیداللہ میر جملہ تھے جنھیں فرخ سیر کی طبیعت میں بڑا دخل تھا اور جو سادات بارہہ کے خلاف ہمیشہ شہنشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ انھیں درباریوں میں نظام الملک بھی تھے جو آگے چلکر دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور بالآخر اپنے صوبہ کو مرکز سے علیحدہ کرکے مختار اور آزاد ہو گئے۔ ان تمام مقتدر اصحاب کے ساتھ پورے جتھے تھے جو ہمیشہ اپنے حریفوں کو ذلیل و خوار کرنے اور خود امورِ سلطنت میں زیادہ سے زیادہ عمل دخل پانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ شہنشاہ کا سارا وقت انھیں سازشوں میں گزرتا تھا اور درباری اُمرا بھی اپنی رہی سہی سپاہیانہ قوتیں اور مدبرانہ سوجھ بوجھ دربار کی شطرنج پر مہروں کے اَدلنے بَدلنے پر صرف کرتے رہتے تھے۔ اشخاص اور افراد سے قطع نظر دربار میں چند مستقل جماعتیں تھیں ایک جماعت مغلوں کی تھی جس میں ایرانی اور تورانی شامل تھے۔ تورانی عقیدے کے اعتبار سے سُنّی تھے اور ان کا تعلق بانیٔ سلطنت بابر کے وطن سے تھا، اس لئے قدرتی طور پر مغل شاہنشاہوں نے ہمیشہ ان پر عنایت کی۔ اپنی تعداد اور اپنے

سرداروں کی فوجی اور شہری امور میں یکساں لیاقت کی بدولت فوج اور عام نظام مملکت میں انہیں بڑا دخل تھا۔ ایرانی تعداد میں ان سے بہت کم تھے اور عقیدہ کے اعتبار سے شیعہ تھے۔ ان کی جماعت میں مشہور حکما شاعر اور علما شامل تھے اور یہ سب حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ عقیدہ کے اختلاف کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کی حریف بن گئی تھیں اور ہر وقت ان کے برسرِ پیکار ہو جانے کا خطرہ موجود تھا۔ البتہ خالص ہندیوں کے مقابلہ میں یہ دونوں جماعتیں ہمیشہ ایک متحدہ محاذ بنانے کے لئے تیار رہتی تھیں۔ انکے بعد افغانوں کی جمعیت تھی، اپنے سپاہیانہ عادات و خصائل اور ہندوستان سے قرب کی وجہ سے ان کی تعداد باقاعدہ اور بیقاعدہ افواج میں خاصی تھی اور اس اعتبار سے ان کی اہمیت مغلوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ان کی ایک ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے ہندوستان پہنچکر جا بجا اپنی مستقل بستیاں قائم کرلی تھیں۔ مثلاً قصور، جلال آباد اور فرخ آباد میں ان کی خاصی آبادی تھی، روہیلکھنڈ میں بھی یہ لوگ آباد تھے لیکن اتنی تعداد کے باوجود انھوں نے علی محمد خاں داؤد زئی کے زمانہ سے پہلے ملک کی سیاسی تاریخ میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ علی محمد خاں نے بریلی اور آنولہ میں اس سلطنت کی بنیا دڈالی جو بعد میں روہیلہ حکومت کہلائی اور جس کا ورثہ موجودہ نوابانِ رامپور تک پہنچا ہے۔ اسی طرح فرخ آباد میں نواب محمد خاں بنگش نے اپنی ریاست کو فروغ دیا۔ یہ دونوں ریاستیں سیاست سے قطع نظر علمی و ادبی اعتبار سے بھی تاریخ میں قابلِ ذکر ہیں اور بہت سے شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ ملتا ہے جو ان درباروں سے وابستہ رہے ہیں متفرق غیر ملکیوں میں عرب، حبشی، رومی، اور فرنگی تھے۔ ان جماعتوں کو کسی جتھے کی حیثیت سے کوئی بڑا مرتبہ حاصل نہ تھا۔ لیکن ان میں سے بعض لوگ ذاتی طور پر اہم مناصب پر

فائز ہونے کے باعث امور ملکی میں بڑا دخل رکھتے تھے، مثلاً دلی کا شہر کوتوال بالعموم حبشی ہوا کرتا تھا۔ ان سب کے مقابلہ میں "ہندوستان زا" یا ہندوستانی جماعت تھی۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کے آباؤ اجداد باہر سے آئے تھے لیکن جن کی کئی کئی نسلیں یہیں گزر چکی تھیں اور وہ لوگ بھی شامل تھے جو اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلی قسم کے ہندوستانیوں میں مثلاً سادات بارہہ تھے جن کی کتنی ہی نسلیں یہاں گزر چکی تھیں۔ دوسری طرف راجپوت، جاٹ اور دوسرے ہندو تھے جو سرکاری ملازمتوں، دفتروں اور عدالتوں میں بعض اہم عہدوں پر قابض تھے۔ پنجاب کے کھتری خاص طور پر ان سرکاری اسامیوں پر تھے۔ ان تمام جماعتوں میں بھی اتفاق اور یکجہتی نہ تھی۔ مثلاً پنجابیوں اور پوربیوں میں ہمیشہ چشمک رہتی تھی۔ اسی طرح شہنشاہ کے مختلف مقربین اور وزیروں کی جماعتیں تھیں جن کا اثر ملکی سیاست پر بہت گہرا تھا کیونکہ صوبہ دار سے لیکر محل کی معمولی ملازمتوں تک میں تقرر کے وقت استحقاق، صلاحیت، لیاقت یا موزونیت کی جگہ صرف اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ کوئی شخص کس جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے تقرر کے دوررس امکانات کیا ہیں۔ خاص طور پر فرخ سیر کے عہد میں ملازمتوں میں یہ اثرات زیادہ راہ پاگئے۔

فرخ سیر کے عہد کا آغاز اس قتل و غارت گری سے ہوا جو اب روایات میں داخل ہو چکی تھی اور لوگ شہنشاہ کے بدلنے کو قیامت صغرا سے کم نہ سمجھتے تھے، اس کے شکار پہلے پہل سعد اللہ خاں، ہدایت کیش خاں اور رشیدی قاسم حبشی تھے، انھیں قلماقنیوں نے جو بالعموم محلات میں پہرہ داری کی خدمت پر مامور ہوتی تھیں مار ڈالا اور ان کی لاشیں تین دن تک فصیل کے نیچے پڑی رہیں۔ اُن کے بعد سبھا چند کی باری آئی، یہ ذوالفقار خاں کا معتمد تھا، اس کی زبان کاٹ لی گئی،

پھر شاہ قدرت اللہ الہ آبادی کی نوبت آئی۔ یہ الہ آباد کے مشہور صوفی شیخ عبدالجلیل کے صاحبزادے تھے، میر جملہ کے اشارہ پر انھیں دھوکے سے بلاکر پھانسی دے دی گئی۔ بعض روایات کے بقول مشہور ہزلگو شاعر سید محمد جعفر نارنولی عرف میر جعفر زٹلی بھی ان لوگوں میں ہیں جنکو تلخی مرگ کا یہ جام جبراً پلا گیا۔ جعفر کا قصور یہ بتایا جاتا ہے کہ فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد سکّہ کے لیئے انھوں نے اپنے رنگ میں یہ شعر لکھا تھا۔

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر

بادشاہ دانہ کش فرّخ سیر

جعفر کا جو ہزلیہ کلام موجود ہے اس کی تاریخی حیثیت بہت کچھ مشتبہ ہے اور یقیناً اس کا ایک حصّہ الحاقی ہے لیکن یہ کلام ادنےٰ اور پست درجہ کا ہونے کے باوجود اپنے عہد کی ترجمانی بڑی خوبی سے کرتا ہے۔ جو فساد سوسائٹی میں راہ پا گیا تھا، اس کا شعرا کے کلام میں جھلک آنا بالکل قدرتی امر ہے اور اس اعتبار سے یہ سارا کلام ایک زوال آمادہ سوسائٹی کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ جن لوگوں کی مدد سے فرخ سیر نے تخت حاصل کیا تھا وہ حکومت کے معاملات میں مطلق العنانی کے خواہش مند ہوں گے۔ چنانچہ سید بھائیوں میں سے عبداللہ خاں وزارت کے طلب گار ہوئے، فرخ سیر اس سے انکار کی مجال نہ رکھتا تھا لیکن دقت یہ آپڑی تھی کہ بقول خود وہ غازی الدین احمد بیگ غالب جنگ سے اس منصب کا وعدہ کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے تجویز کی کہ عبداللہ خاں وکیل مطلق کا عہدہ قبول کرلیں اور عملاً ساری طاقت انھیں کے ہاتھ میں رہے اور غازی الدین کو برائے نام وزیر مقرر کر کے بادشاہ کی بات بھی رہ جائے۔ لیکن عبداللہ خاں اس پر راضی نہ ہوتے اور انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ تخت اور سلطنت میں نے

اپنی شمشیر سے حاصل کیا ہے۔ آخر کار فرخ سیر کو جھکنا پڑا اور اُسے اپنی مجبوری
و بیچارگی کا پہلی مرتبہ احساس ہوا۔ یہ سید بھائیوں سے اس بدمزگی کی ابتدا تھی،
جس کی انتہا فرخ سیر کو دیکھنا باقی تھی۔ اس وقت ملک کی جو عام حالت ہو چکی
تھی اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سنہ ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۴ء میں راجہ اجیت سنگھ راٹھور
کے خلاف ایک مہم روانہ کرنا پڑی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بہادر شاہ کی وفات
کے بعد سلطنت کی ابتری اور انتشار سے فائدہ اُٹھا کر اجیت سنگھ نے سرکشی
اختیار کی اور اپنے علاقہ میں گائے کا ذبیحہ ممنوع کر دیا۔ عالمگیری مسجد میں مسلمانوں
کو نماز پڑھنے اور اذان دینے سے بھی روک دیا گیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کی
بلکہ جودھپور سے شاہی عہدیداروں کو نکال باہر کیا۔ ان کی جائداد اور مکانوں پر
قبضہ کر کے انھیں برباد کر دیا۔ بلکہ بڑھ کر اجمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ حسین علی خاں بذاتِ
خود اس مہم پر روانہ ہوئے۔ راستہ میں سب سے بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ
ڈاکوؤں اور رہزنوں نے سفر اور قیام دونوں مشکل بنا دیئے۔ جہاں کہیں فوج کا
پڑاؤ ہوتا وہاں لشکر کے چاروں طرف خندق کھودی جاتی اور میواتی چوکیداروں کو
مقرر کرنا پڑتا جو رات بھر جاگ کر پہرہ دیتے۔ جب چور اور ڈاکوؤں کی ہمت ایسی
بڑھ گئی ہو کہ وہ شاہی لشکر پر چڑھ آئیں اور مسلح فوج سے نہ ڈریں تو ظاہر ہے کہ
پُرامن بستیوں پر ان کی شورہ پشتی سے کیا کچھ نہ گزرتا ہوگا، عوام کا ان کے ہاتھوں
کیا حال ہوتا ہوگا اور ملک میں امن و امان اور سلامتی مال و جان کی کیا صورت
ہو گی۔ اس معرکہ کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مختصر یہ کہ راجہ
اجیت سنگھ نے ان شرائط پر صلح کر لی کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی شہنشاہ سے
کر دے گا اور اپنے بیٹے راجہ ابھائے سنگھ کو وفاداری کی ضمانت میں حسین علی خاں
کے ہمراہ شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کر دے گا اور جب اسے طلب کیا جائے گا

وہ خود بھی بلا تامل واپس وپیش دارالخلافہ میں حاضر ہوگا ۔

اس شادی کے حالات ہمیں کسی قدر تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے بعض مورخین کے بقول شہزادی کا نام بائی اندر کنور تھا۔ اجیت سنگھ سے مصالحت کے بعد حسین علی خاں کو دارالخلافہ واپس پہنچنے کی اس قدر عجلت تھی کہ وہ اتنا اِنتظار نہ کرسکے کہ راجہ لڑکی کو رخصت کرنے کی مناسب تیاری کرسکیں، چنانچہ ۱۲ رجمادی الاول سنہ ۱۱۲۷ھ / ۱۷۱۵ء کو شہنشاہ نے شایستہ خاں کو روانہ کیا کہ وہ شاہزادی کو جودھپور سے لے آئیں۔ اور وہ ۲۵ رمضان تک شہزادی کو لے کر واپس ہوئے، اسے امیرالامرا کے خاص محل میں اتارا گیا اور قطب الملک کو شادی کا اہتمام اور انصرام سپرد ہوا ۔ چار روز بعد فرخ سیر امیرالامرا کے محل میں گئے، پہلے شہزادی کو شریعت اِسلام میں داخل کیا گیا اور پھر شریعت خاں نے جو قاضی القضاہ تھے ایک لاکھ اشرفی کے مہر پر بادشاہ کے ساتھ اس کا نکاح پڑھا امرا نے نذریں گزاریں اور مبارک بادیاں پیش کیں ۔ قاضی صاحب کو بطور انعام دو ہزار روپے عطا ہوئے ۔

اس موقع پر فرخ سیر کی والدہ نے جو سامان نوشہ کی طرف سے عروس کے لئے بھیجا تھا اور جسے اصطلاحاً ساچق کہتے ہیں وہ واقعی شاہانہ تھا ۔ اِس جلوس کے ساتھ ارکان دولت اپنے تمام ساز و سامان سے شریک تھے اور جب برات امیرالامرا کے محل تک پہنچی تو ان کی شاہانہ ضیافت سے تواضع کی گئی ۔ اس کے بعد مہندی کی رسم ادا کی گئی یعنی خود فرخ سیر کے ہاتھوں اور پیروں کو لگانے کے لئے عروس کی طرف سے مہندی آئی اور جو لوگ اسے لے کر آئے ان کی شاہی محل میں بڑی تواضع اور خاطر مدارات کی گئی ۔ شادی کا خاص دن آیا تو تمام دیوان عام، جلوخانے اور محل ہی سڑکوں پر دورویہ چراغاں کیا گیا۔

جمنا کی طرف میدان میں بانس گاڑ کر ان پر بھی چراغ روشن کئے گئے۔ شام کو ۹ بجے کے قریب فرخ سیر شاہی محل کے دلی دروازہ سے برآمد ہوئے۔ وہ ایک تخت رواں پر متمکن تھے اور شادی کا وہ جوڑا پہنے ہوئے تھے جو عروس کے والد نے بھیجا تھا اور جسے شہانہ کا جوڑا کہتے ہیں۔ تخت رواں کے آگے ایسے تخت تھے جن پر گانے اور ناچنے والیوں کے طائفے اپنے اپنے کمالات کا اظہار کرتے چلے جا رہے تھے۔ ہر طرف آتش بازی چھوٹ رہی تھی جس سے رہین رشک آسمان اور رات دن سے زیادہ روشن ہو رہی تھی، اس ترک و احتشام سے یہ جلوس امیر الامرا کے محل تک پہنچا اور شادی کی ساری رسمیں ادا کی گئیں۔ مورخین نے اس شادی کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور سید عبدالجلیل بلگرامی نے فارسی میں ایک مثنوی بنام کتخدائی فرخ لکھی ہے۔ یہ مثنوی ایک مرتبہ شائع بھی ہوئی تھی لیکن کمیاب ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اسکا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے مختلف فنکارانہ صناعیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ چونکہ شہنشاہ نے ایک ہندو عورت سے شادی کی تھی۔ اسنے بھی اس قران کی مناسبت سے مختلف ستاروں اور برج آسمانی کے ہندی نام فارسی تلمیحات کے ساتھ نظم کر دیئے اور ان رسموں میں بھی جنکا اس موقع پر اعادہ کیا گیا ہندو مسلم سنجوگ کا اثر جھلکتا تھا مثلاً براتیوں کی تواضع کے لئے عرق گلاب، شکر اور افیون سے ایک شربت تیار کیا گیا، اگرچہ اُمرا خود علانیہ بہت سی ایسی حرکتیں کرتے تھے جو شارع اسلام کے صریح خلاف تھیں۔ تاہم اِس موقع پر اُن میں سے بعض نے اس شربت کے پینے میں تامّل کیا، لیکن راجپوتوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنے رسوم کے مُطابق اسے اشد ضروری سمجھتے ہیں اور بادشاہ کو انکی خوشنودی اس درجہ محبوب تھی کہ بالآخر سب کو یہ شربت پینا ہی پڑا۔ اس موقع پر ایک نئی رسم بھی ادا ہوئی جو بقول مورخین اِس سے پہلے شاہی خاندان کی شادیوں میں نظر

نہ آئی تھی، سونے کا ایک طبق تیار کیا جسکے پانچ حصّے الگ الگ تھے۔ ایک حصّے میں ہیرے دوسرے میں الماس، تیسرے میں عقیق، چوتھے میں نیلم اور درمیان میں نہایت قیمتی موتی چُنے تھے۔ شادی کے بعد بھی تقریبات کا سلسلہ کم و بیش ایک مہینے تک جاری رہا جسمیں بادشاہ نے دل کھولکر داد عیش دی اِس شادی کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے شادی شاید چند مہینے پہلے ہی انجام پا چکی ہوتی لیکن فرخ سیر اس زمانے میں سخت بیمار تھا بیماری کی مختلف تشریحات کی گئی ہیں۔ بہرحال صُورت ایسی تھی کہ اسے اپنی شادی جسکے لئے وہ بیتاب تھا کئی ماہ کے لئے ملتوی کرنا پڑی اور اس موقع پر جب شاہی طبیب ناکام رہے تو ایک برطانوی ڈاکٹر ولیم ہملٹن سے مدد لینا پڑی۔ یہ ڈاکٹر اس وفد کے ہمراہ تھا جو بنگال سے ناظم بنگال مرشد قلی خاں کے خلاف شکایات لیکر آیا تھا۔ عالمگیر نے انگریزوں کو جو مراعات دی تھیں انہیں ایک یہ تھی کہ انگریزوں کا مال تجارت چنگی کے محصول سے مستثنیٰ ہوگا، علاوہ سرکاری خزانہ کے نقصان کے اسمیں ایک قباحت یہ بھی تھی کہ اس سامان کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا تھا اور نہ اسکی نوعیت کا پتہ چل سکتا تھا۔ چنانچہ مرشد قلی خاں نے اس مال کی تلاشی اور اسپر محصول وصول کرنیکا حکم دے دیا۔ اسی کے خلاف ڈاکٹر ہملٹن اور اسکے ساتھی بادشاہ سلامت کے سامنے عرضی پیش کرنے آئے تھے ہملٹن نے بڑی توجہ اور محنت سے فرخ سیر کا علاج کیا اور بالآخر اسے صحت ہوگئی غسل صحت (۳ دسمبر ۱۷۱۵ء) کے موقع پر ہملٹن موجود تھا اور ایک ہفتہ بعد بادشاہ نے دربار میں اسے بطور شکریہ قیمتی تحائف پیش کئے۔ انگریزوں کو اپنی تجارت کے سلسلے میں جو نفع پہنچا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ فرخ سیر کی اس روش کے بعد جو نتائج نکلے انکا ذکر کرنے سے پہلے خود اسکی اس دلہن کی کہانی ختم کرنا ضروری ہے، فرخ سیر کے انتقال کے بعد اسے اسکے باپ اجیت سنگھ کے حوالہ کر دیا گیا اسنے ہندوانہ طریقے سے خود کو پاک کرنیکے لئے نہان کیا اور اسلام کیساتھ مسلمانی لباس بھی اتار پھینکا اور اپنے تمام قیمتی ساز و سامان لیکر جسکا اندازہ تقریباً ایک کروڑ روپیہ ہے، جودھپور چلی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شاہی حرم میں ایک مرتبہ داخل ہونیکے بعد کوئی راجپوت شہزادی دوبارہ ہندو ہو کر اپنے گھر لوٹ گئی ہو۔ مسلمانوں نے اسکے خلاف احتجاج بھی کیا کہ مسلمان ہونیکے بعد مسلم کو دوبارہ کافروں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا لیکن انکی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اِدھر تو یہ رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں ، اُدھر ہندوستان کی سیاسی اُفق پر طوفانی بادلوں کے ٹکڑے آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے۔ شمالی ہندوستان میں سکھوں کی طاقت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور یہ نیم مذہبی اور نیم عسکری طبقہ سلطنت دلی کی بساط اُلٹنے کی فکر میں تھا۔ زین الدین احمد خاں فوجدار سرہند سے جہاں تک ہو سکا وہ ان سے نبرد آزما ہوتا رہا۔ فرخ سیر نے سنہ ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء میں عبدالصمد خاں کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ سکھوں کی پوری طرح سرکوبی کیجائے۔ شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں تک کہ اندرونِ قلعہ کھانے پینے کے ذخیرے ختم ہو گئے ، لیکن سکھوں نے بڑے استقلال کا ثبوت دیا اور پے در پے مختلف مقامات پر چھاپے مارتے رہے۔ آخرکار دلی سے ایک اور جماعت بطور کمک روانہ کی گئی اور آخر میں سکھ اس بُری طرح گِھر گئے کہ انھیں ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ جسوقت شاہی فوج قلعہ کے اندر داخل ہوئی تو دو تین سو کے قریب سپاہی تو تہ تیغ ہوئے اور باقی قید کر لیئے گئے۔ یہ واقعہ ۲۱ ذی الحجہ سنہ ۱۱۲۷ھ مطابق ۱۷ دسمبر سنہ ۱۷۱۵ء کا ہے اور یہ ظفر مند فوج ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۱۲۸ھ کو دہلی میں داخل ہوئی۔ قیدیوں کے سردار کو ایک آہنی پنجرہ میں بند کر کے ہاتھی پر رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے بدن پر مغلوں کا درباری زری کا جامہ تھا اور اس پر ایک مغل سردار برہنہ تیغ علم کئے تھا۔ آگے آگے ایک جلوس کی شکل میں نیزوں اور بانسوں پر اُن سرکش سکھوں کے سر آویزاں تھے جو شاہی لشکر کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ گرو کے ہاتھی کے بعد سات سو چالیس دوسرے قیدی تھے جو اونٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر مضحکہ خیز شکلوں کی ٹوپیاں رکھدی گئی تھیں اور ان میں سے بعض کو جانوروں کی کھالیں پہنا دی گئی تھیں کہ دُور سے دیکھنے والوں کو وہ جنگلی جانور نظر آتے تھے۔ جب یہ جلوس دِلی کی

گلیوں میں سے گزرا تو تماشائیوں کا ہجوم ہوگیا۔ لوگ شاہی لشکر کی کامیابی پر بے حد خوش و خرّم نظر آرہے تھے اور قیدیوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ ان کو ان کے اعمال کی سزا دی گئی ہے۔ اس تشہیر کے بعد شاہی حکم کے مطابق ان میں سے بیشتر کو قتل کر دیا گیا۔

فتحمندی اور کامیابی کا یہ رنگ ایسا تھا جیسے تاریک رات میں آسمان پر سے بادل کا ٹکڑا ہٹ جانے سے کوئی ٹمٹماتا ہوا ستارہ ایک لمحہ کے لئے اپنی جھلک دکھا جائے۔ ہم آج جب اس دور کا کلام پڑھتے ہیں اور فرخ سیر اور اس کے معاصرین کی تعریف میں قصیدے ہماری نظر سے گزرتے ہیں تو کبھی کبھی ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ ایک ایسے بادشاہ کے لئے جس کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی، کس طرح اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں لیکن جب ہم اس قسم کے واقعات کی جھلک دیکھتے ہیں جیسا کہ سکھوں کی یہ سرکوبی تھی تو معلوم ہو جاتا ہے کہ عام لوگوں کے لئے جو بادشاہ کی خانگی زندگی سے دور تھے اور اس کی اُلجھنوں اور دِقّتوں سے آشنا نہ تھے ایسے واقعات یہ یقین دلانے کے لئے کافی تھے کہ شہنشاہ کے اقبال کا آفتاب ہنوز نقطۂ عروج پر تھا۔ یہ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ جو سلطنت ایک پُرانے گھمبیر سایہ دار درخت کی طرح سایہ فگن تھی اس کی جڑوں میں مدّتوں سے گھُن لگ چکا تھا اور وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ بادِ تند و تیز کا ایک جھونکا اسے گرا دینے کے لئے کافی تھا۔

اسی زمانے میں ایک اور طاقت آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھی، یہ جاٹ تھے۔ یہ لوگ صدیوں سے جنوب میں آگرہ اور دلّی کے درمیان آباد تھے۔ یہ جری اور جفاکش لوگ تھے۔ ان میں سے بعض کاشت کرتے تھے بعض مویشی

پالتے تھے۔ ان کی روایت کچھ ایسی تھی کہ متھرا اور دلی کی سڑک پر گویا ان کی عملداری تھی۔ دارالانشا کا مصنف (بحوالہ آخری مغل ص ۱۲۳) لکھتا ہے کہ جاٹوں کی دست درازی کی وجہ سے یہ سڑک تقریباً دو مہینے کے لئے بالکل بند ہو گئی تھی اور سیکڑوں مسافر جمع ہو گئے تھے۔ ۱۷۱۲ء میں جب ہالینڈ کا سفیر اور اس کے ہمراہی اس راستہ سے گزرے تو انھوں نے سڑک کو اسی حالت میں پایا۔ اُس کے ایک دو سال بعد جب انگریزی سفیر جان سرمان گزرا تو اس نے بھی راستہ کا یہی حال دیکھا۔

جاٹوں کا حال یہ ہے کہ شاہجہاں کے عہد میں سنہ ۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء میں انھوں نے متھرا کے فوجدار مرشد قلی خاں کو مار ڈالا۔ عالمگیر کے عہد میں بھی بار بار انکی سرکشی کے مظاہرے ہوتے رہے۔ چنانچہ ایک اور فوجدار عبداللہ ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس پر عالمگیر بہت برہم ہوا اور خود آگرہ سے اس فتنہ کے استیصال کے لئے روانہ ہوا اور اللہ وردی خاں کے بیٹے حسن علی خاں کو فوجدار مقرر کر کے پہلے سے روانہ کر دیا۔ جاٹ سردار گوکل اور اس کے ساتھی گرفتار کر کے قتل کر دیے گئے۔ گوکل کی لڑکی کی شادی شہنشاہ کے ایک غلام سے کر دی گئی اور اس کے لڑکے نے اسلام قبول کر لیا۔ اس زمانہ میں عالمگیر کو دکن میں ایک طویل جنگ لڑنا پڑی۔ قطع نظر استحکام سلطنت کے جس کے لیے دکن کی فتح ضروری تھی، متعدد بار حملوں کی ناکامی نے اسے شہنشاہ کی ذاتی عزت کا معاملہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ شاہی خزانے اور افواج کا سارا زور اسی مہم پر صرف کیا گیا اور شہنشاہ نے خود میدان میں فوجوں کی کمان سنبھالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کی طبیعت دیگر امور مملکت کی طرف سے ہٹنے پر صوبجاتی گورنر آرام طلب ہو گئے، باز پرس کا خطرہ نہ رہا تو انھوں نے ایسے پاؤں پھیلائے کہ انتظام حکومت میں خلل آنے لگا اور جاٹوں نے بھی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا، یہاں تک کہ

مجبور ہو کر سنہ ۱۰۹۹ھ / ۱۶۸۷ء میں خان جہاں، ظفر جنگ کوکلتاش اور اعظم شاہ کے بیٹے بیدار بخت کو دکن کی مہم چھوڑ کر شمالی ہند میں امن وامان قائم کرنے کے لئے بھیجنا پڑا کہ وہ وہاں پہنچ کر ان کی ایسی سرکوبی کریں کہ ہمیشہ کے لئے اس فتنہ کا استیصال ہو جائے۔ اس وقت جاٹوں کا مرکز ایک گاؤں سانسنی تھا جو بھرت پور کے شمال مغرب میں تقریبًا سولہ میل کے فاصلہ پر تھا، ان کا سردار راجہ رام مارا گیا اور اس کا سر کاٹ کر شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا۔ غرض یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ سنہ ۱۱۱۹ھ میں رضا بہادر نے پھر سانسنی پر حملہ کیا اور مالِ غنیمت میں دس گاڑی اسلحہ ایک ہزار جاٹوں کے سر فتح کا انعام ہاتھ آئے۔ جب بہادر شاہ اور اعظم شاہ نے تخت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف طاقت آزمائی کی تو چورامن جاٹوں کا سردار تھا وہ شاہی فوجوں کے آس پاس اس نیت سے ایک جماعت لیکر آگیا کہ جو ہارے اس کے مالِ غنیمت میں یہ بھی اپنا حصہ لگائے۔ اور واقعی اس قدر مالِ غنیمت اس کے حصہ میں آیا کہ وہ عرصہ تک ملک کے سیاسی امور میں ایک نمایاں شخص بن گیا۔ بہادر شاہ جب آگرہ پہنچا تو چورامن بھی حاضر خدمت ہوا اور پندرہ سو ذات، اور پانچسو سوار کے منصب سے سرفراز کیا گیا لیکن اس کی لوٹ مار میں کوئی فرق نہیں آیا چنانچہ جب جہاں دار شاہ اور فرخ سیر میں تخت کے لئے جنگ ہوئی تو پھر ایک مرتبہ چورامن اور اس کے ساتھیوں نے طرفین کے لشکروں میں گھس کر دل کھول کر لوٹ مار کی۔ فرخ سیر کے ابتدائی عہد میں بھی ان کی سرکوبی کی بہت کوشش کی گئی۔ اس وقت بدامنی کا یہ حال ہو چکا تھا کہ عین اس وقت جب جاٹوں کے قلعہ کا محاصرہ ہو رہا تھا اور شاہی لشکر جس کے ساتھ نامور سردار اور امرا اپنے ساز و سامان سے

موجود تھے اور فوجی دستے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے مٹا دینے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ سوداگروں کا ایک قافلہ تیرہ سو گاڑیاں گھی سے لدی ہوئی لے کر گزرا اور اس کے ساتھ ایک ہزار کے قریب مسلّح محافظ تھے، جاٹ اور ان کے ساتھی اس قافلہ پر لوٹ پڑے اور تقریباً بیس لاکھ روپیہ کی مالیت کا سامان لوٹ لیا۔ اگرچہ اس زمانہ میں کچھ دنوں کے لئے بظاہر جاٹوں کی سرکوبی ہوگئی لیکن اس فتنہ کا پورا استیصال نہ ہوسکا، کیوں کہ یہاں بھی امراء کی آپس کی عداوت اور دربار کی سازشیں اپنا رنگ دکھا رہی تھیں۔ بظاہر جاٹوں کی طاقت ایسی نہ تھی جس سے اتنی بڑی سلطنت کو خطرہ ہوتا لیکن ان کی یورشوں نے جو بد اطمینانی پھیلائی وہ بڑی تباہ کن تھی، لوگوں کے حوصلے پست ہوگئے اور ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ پھر یہ جاٹوں کی طاقت انفرادی طور پر فیصلہ کن نہیں تھی۔ لیکن جب بہت سے عناصر ایک ہی مقصد کے لئے متحد ہوجائیں تو سب کی متحدہ قوت یقیناً فیصلہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ چنانچہ سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کا خطرہ اس لئے شدید تھا کہ ان سب کا مقصد ایک تھا۔

عین اس وقت درباری سازشوں کا ایک اور مظاہرہ ہوا۔ یہ میر جملہ خاں اور قطب الملک کی دشمنی تھی جو اب رنگ لائی۔ میر جملہ کو دربار سے دور بھیجنے کے لئے پٹنہ کا گورنر مقرر کردیا گیا۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد وہ وہاں سے واپس لوٹ آیا اور اس طرح دلّی میں داخل ہوگیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ قطب الملک نے فرخ سیر سے اس کی شکایت کی۔ فرخ سیر کا حال یہ تھا کہ وہ اب سید بھائیوں سے ڈرنے لگا تھا۔ چنانچہ میر جملہ کو اس مرتبہ لاہور جانے کا حکم ملا۔ لیکن وہ کئی دن تک ٹالتا رہا یہاں تک کہ اس کے لشکر کے مغل سپاہیوں نے جن کی تعداد سات آٹھ ہزار کے قریب تھی، بغاوت کردی۔ بعض مورخین کا خیال

ہے کہ سپاہیوں نے خود بغاوت کی تھی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا میر جملہ کے اشارہ پر ہوا۔ بہر حال ان لشکریوں کا مطالبہ تھا کہ ان کی تنخواہ کا بقایا فوراً ملنا چاہیئے اور جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو جائے، میر جملہ کے دہلی سے لاہور جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہنگامہ کوئی مہینہ بھر رہا۔ یہاں تک کہ قطب الملک کو اپنی زندگی خطرہ میں نظر آنے لگی بلکہ ایک روز تو گلی کوچے مغل سپاہیوں سے بھر گئے جو پوری طرح مسلح ہو کر بازاروں میں شور کرتے پھر رہے تھے اور غالباً قطب الملک کے مکان پر حملہ کرنے کے لئے کسی بہانہ کی تلاش میں تھے۔ ظاہر ہے اہل شہر کی اس وقت کیا حالت ہوگی اور شہر میں امن وامان کی کیا صورت نظر آتی ہوگی۔ بہر حال یہ طے پایا کہ شاہی خزانہ سے ان کی بقایا کی ادائیگی کے لئے دس لاکھ روپے دے دیئے جائیں اور بادشاہ نے میر جملہ کو اس کے خطاب سے محروم کر دیا۔ اگر چہ بظاہر یہ قضیہ رفع دفع ہوا لیکن ایک اور پہلو سے دیکھیں تو اس سے دلی کے سیاسی اکھاڑے کے بارے میں عجیب رائے قائم کرنی پڑتی ہے۔ معلوم ہوتا ہو کہ امراء اور وزراء اپنی تائید کے لئے باقاعدہ لشکری رکھتے تھے جنکا کام ان کی تائید کرنا اور اس سلسلہ میں دہشت پھیلانا تھا۔ یہ کرایہ کے سپاہی ظاہر ہے کسی سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہوتے ہیں۔ ان کی وفاداری کسی ذات، مقصد یا جھنڈے کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ جہاں پیسہ ملے وہاں یہ موجود ہو جاتے ہیں۔ جب سپاہیوں کا یہ حال ہو تو کیا تو غنیم کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور کیا ان سے اندرونِ ملک میں نظم ونسق قائم رکھنے کی توقع ہو سکتی ہے۔

فرخ سیر کے عہد کی درباری سازشوں کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اس کے مختصر عہدِ حکومت کا کوئی دن اور دن رات کا کوئی حصہ

ان سازشوں سے خالی نہ گزرتا تھا۔ دراصل بات یہ تھی کہ ایک طرف سادات بارہہ تھے جو فرخ سیر کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ سمجھتے تھے، انھوں نے ہی اسے تخت پر بٹھایا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ درباری بساط کے اور تمام مہرے بھی انہیں کی چشم و ابرو کے اشارہ پر حرکت کریں۔ یہ بات ایک طرف خود فرخ سیر اور دوسری طرف دوسرے امرا اور متوسلین کو گوارا نہ تھی۔ فرخ سیر لاکھ کم زور اور سیدوں کا ممنون کرم سہی پھر بھی اس کی رگوں میں تیمور اور بابر کا خون تھا اور وہ دلّی کے لال قلعہ میں اکبر، جہاں گیر، شاہجہاں اور اورنگزیب کے وارث کی حیثیت سے موجود تھا، اور اس باب میں بعض امرا جو خود سیدوں کی دراز دستی سے تنگ تھے، فرخ سیر کی تائید کرتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر طرف سازشوں کا زور تھا۔ کسی کو سلطنت کی بہبودی یا رعیّت کی فلاح کی طرف توجّہ نہ تھی، آخر کار فرخ سیر کا انجام آپہنچا۔ ۹ ربیع الثانی سنہ ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) کو چار سو آدمی شاہی محلسرا میں گھس پڑے۔ عورتوں نے ہتھیار سنبھالے اور قلماقنیوں نے مقابلہ کرنا چاہا، ان میں سے بعض زخمی ہوئیں اور بعض ماری گئیں۔ فرخ سیر ڈر کے مارے ایک چھوٹے سے کمرے میں جا چھپا۔ اس کا دروازہ توڑ ڈالا گیا اور فرخ سیر ہاتھ میں ڈھال اور تلوار لیئے نکلا اور جواںمردی سے مقابلہ کرنا چاہا۔ کاش اس نے تلوار اُس وقت سنبھالی ہوتی جب اس کا موقع تھا۔ کیوں کہ اب وہ وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس کی والدہ، بیوی، لڑکی اور حرم کی تمام دوسری خواتین اس کے چاروں طرف آگئیں تاکہ اسے گھیرے میں لے کر بچا سکیں۔ لیکن ان کے نازک جسم کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ سپاہیوں نے دھکے دے دے کر ان کو ایک طرف ہٹا دیا۔ اور فرخ سیر کو گھیر لیا، ہر طرف سے وار ہونے لگے۔ کسی نے اسے گردن سے پکڑنا چاہا اور عمامہ اس کے سر سے

گر پڑا۔ پھر اسے زمین پر گھسیٹا گیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ آل تیمور میں شاید ہی کوئی شاہزادہ ایسا حسین ہوا ہو جیسا فرخ سیر تھا۔ اور اس وقت اسکی بے بسی اور بے آبروئی دیکھ کر انقلاب آسمان کا پورا اندازہ ہوتا تھا۔ غرض اس ہیئت سے اس شہنشاہ ہند کو گھسیٹ کر دیوان خاص میں لایا گیا جہاں پہلے سے طے شدہ تجویز کے مطابق قطب الملک موجود تھا۔ قطب الملک کے حکم سے فرخ سیر کی آنکھوں میں سلائی ڈال کر اسے اندھا کر دیا گیا اور محل میں جو کچھ سازوسامان تھا اُسے لوٹ لیا گیا۔

اندھے کئے جانے کے بعد فرخ سیر کو ترپولیہ کے اوپر ایک کمرہ میں قید کر دیا گیا، جہاں اس پر طرح طرح سے سختی کی گئی، چار چار پانچ پانچ روز تک وہ پانی سے محروم رہتا تھا اور ایسی غذا دی جاتی تھی جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بیمار پڑ گیا۔ حوائج ضروری تک کے لئے اسے پانی نہ ملتا تھا اور وہ نجاست صاف کرنے کے لئے بدن کے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر استعمال کرتا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا اور صبر و شکر سے سارا وقت قرآن پاک کی تلاوت میں گزارتا۔ جب اس اذیت سے بھی اس کا خاتمہ نہ ہو سکا تو آخرکار جلاد کو ہی اسے اس مشکل سے نجات دینے کے لئے بھیجنا پڑا اور ۸، ۹ جمادی الثانی ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۷/۲۸ اپریل ۱۷۱۹ء کو آخر اسے زنداں اور زندگی دونوں سے نجات مل گئی اور وہ قید حیات و بند غم دونوں سے بیک وقت رہا ہو گیا۔ سیر المتاخرین کے مصنف نے اس واقعہ کو دوسری طرح بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ فرخ سیر نے کوشش کی کہ کسی طرح سیدوں سے اس کی صفائی ہو جائے، یہ ممکن نہ ہوا تو اس نے قید سے نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا اور اس پر سخت تنبیہ کی گئی جس پر اس نے قلعہ کی دیوار سے سر مار کر خودکشی

کر لی۔ جب جنازہ نماز کے لیے اکبرآبادی مسجد میں لایا گیا تو کم از کم پندرہ بیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا اور تمام لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ سڑکوں اور گلیوں میں ہجوم تھا اور لوگ برابر گریہ و زاری کرتے جا رہے تھے۔ وہ درویش اور فقراء جن کی فرخ سیر پرورش کرتا تھا جنازہ کے ساتھ ساتھ تھے۔ یہ لوگ اپنے کپڑے پھاڑتے اور سروں پر خاک ڈال ڈال کر اپنے انتہائی غم اور غصّہ کا اظہار کر رہے تھے۔ عورتیں مکانوں کی چھتوں پر سے رو رہی تھیں اور سیدوں کے ملازمین اور سپاہیوں پر پتھر اور اینٹیں پھینک رہی تھیں۔ آخر کار اسے ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کر دیا گیا۔ جنازہ کے ساتھ بطور توشہ جو غلّہ اور نقدی خیرات کے لئے لائی گئی تھی فقیروں نے اسے لینے سے انکار کر دیا بلکہ وہ خود کئی دن تک اس کی قبر پر درود اور فاتحہ خوانی کرتے رہے اور مدّتوں لوگ اس کے قاتلوں سے سخت نفرت کا اظہار کرتے رہے۔ شہر کے درویش اور فقراء جمعرات کے دن اس کی قبر پر جمع ہوتے تھے اور خیرات کرتے تھے۔ وہ امراء اور سردار جنکا تعلق سیّدوں سے تھا جب راستہ گلی نکلتے تو ان کی تواضع لعنت سے کی جاتی۔

سید حسین علی کچھ دنوں اپنے اقتدار اعلیٰ کو سنبھالے رہے لیکن جس طرح انھیں طاقت حاصل ہوئی تھی اور پھر جس طرح وہ اسے قائم رکھنا چاہتے تھے اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ دیر پا نہیں تھی۔ امراء اور سرداران لشکر میں سے اکثر ایک طرف نالاں تھے اور دوسری طرف وہ اس روّیہ کو جو سیدوں نے شہنشاہ کے معاملہ میں اختیار کیا تھا بالکل پسند نہ کرتے تھے اسوقت تک شہنشاہیت پر ظل الٰہی کا تصور کچھ نہ کچھ باقی تھا اور جو ذلت شہنشاہ کو سیّدوں کے ہاتھوں نصیب ہوئی اسے بہت سے لوگ شہنشاہ کی ذات سے علیحدہ کر کے آل تیمور کی توہین سمجھتے۔ سید پھر شہنشاہ کے ملازم تھے لیکن وہ شہنشاہ کے

مقابلہ میں ادنیٰ درجہ کے آدمیوں کی زیادہ عزت کرتے۔ غرض حالات اور بدتر ہوتے گئے۔ جاٹوں، سکھوں اور مرہٹوں کی یورش نے حکومت کا رہا سہا وقار بھی کھو دیا۔ یہاں تک کہ محمد شاہ کا عہد آگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ نادر شاہ کے حملہ سے سلطنت کو ایک اور شدید صدمہ پہنچنے والا تھا۔ نادرگردی کے بیان سے پہلے مختصر طور پر سیدوں کے انجام کی کہانی بیان کردینا ضروری ہے حسین علیخاں کی باری پہلے آئی۔ ان کے خلاف سازش میں جو لوگ نمایاں تھے ان میں نواب محمد امین سعادت خاں برہان الملک بھی تھے جو بعد میں اودھ کے صوبہ دار اور بانیٔ سلطنت اودھ بنے اور جن کی اولاد نے ۱۸۵۶ء تک اودھ میں سلطنت کی جس کا سلسلہ واجد علی شاہ پر ختم ہوتا ہے۔ حیدر قلی اس سازش میں دوسرے سرگرم رکن تھے۔ حسین علی خاں حسب معمول شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے واپسی میں جب وہ پالکی میں سوار لوٹ رہے تھے تو حیدر بیگ دو تین اور مغل سپاہیوں کے ساتھ قریب آگیا اور شکایت کرنے کے بہانے سے ایک عرضی ہاتھ میں لئے پالکی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ پہرہ کے سپاہیوں نے اسے روکنا بھی چاہا لیکن حسین علی خاں نے جو بالکل بے خبر تھے انھیں منع کردیا اور وہ پالکی سے اور قریب ہوگیا۔ حسین علی خاں نے درخواست ہاتھ میں لے لی اور حقّہ بردار کو حُقّہ پیش کرنے کا حکم دیا۔ حسین علی خاں تو حقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور حیدر بیگ نے کمر سے ایک پیش قبض نکال کر پوری طاقت سے حسین علی خاں کے سینہ میں اتار دیا۔ اس پر بھی حسین علی خاں نے حیدر بیگ کے ایک لات ماری جس سے وہ گر پڑا، اس عرصہ میں حسین علی خاں کے جسم سے کافی خون نکل چکا تھا اور وہ کم زور ہونے لگا۔ حیدر بیگ سنبھلا اور اس نے حسین علی خاں کو گھسیٹ کر پالکی میں سے باہر نکال لیا اور سینہ پر چڑھ کر سر کاٹنے لگا اتنے میں کچھ اور مغل

اس کی مدد کو آگئے۔ حسین علی خاں کا سر کاٹ کر حیدر قلی خاں کے خیمہ میں لایا گیا اور محمد امین اسے لیکر محمد شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محمد شاہ کے ایما یا اس کے اشارے پر ہی یہ سب کچھ ہوا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ محمد شاہ کی والدہ بھی اس میں شریک تھیں کیونکہ اس طرح وہ اپنے بیٹے کو سیدوں کی دوامی غلامی سے نجات دلانے کی تدبیر کر رہی تھیں۔ سیدوں نے حسین علی خاں کے قتل کے بعد ایک بار منظم ہونے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد حسین علی خاں کے ساز و سامان کے لوٹنے کی عام اجازت دیدی گئی اور جس شخص کے جو ہاتھ پڑا وہ لے بھاگا۔

عبداللہ خاں جو دارالخلافہ سے دور تھا یہ خبر سنکر بہ عجلت تمام دلی کی طرف روانہ ہوا محمد شاہ نے اسے حضور میں طلب کیا لیکن اس نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ بلکہ یہ کوشش کرنے لگا کہ محمد شاہ کی جگہ کسی اور مغل شاہزادہ کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ آخر محمد ابراہیم کا انتخاب ہوا جو رفیع الشان کا سب سے بڑا بیٹا تھا، اس کی تخت نشینی ۵ ذی الحجہ سنہ ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء کو ہوئی اور اس کے دو روز بعد عبداللہ خاں دارالخلافہ میں داخل ہوا، پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ سپاہیوں کی بھرتی شروع کی اور تقریباً ۹۰ ہزار سپاہی اسکے لشکر میں جمع ہو گئے، اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ عبداللہ خاں کا ارادہ جنگ کرنے کا تھا۔ چنانچہ ۱۳ محرم ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء کو محمد شاہ خود ہاتھی پر سوار ہوکر اس قضیہ کو طے کرنے کے لئے نکلا۔ عبداللہ خاں اور اس کے ساتھی نجم الدین علی نے آخر ہتھیار ڈال دیئے اور عبداللہ خاں کو قید کر لیا گیا۔ ابراہیم شاہ بھی محمد شاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ عبداللہ خاں نے دو سال قید میں گزارے اور سنہ ۱۱۳۵ھ میں اسی عالم میں اس کا انتقال ہو گیا، بعض مورخین نے لکھا ہے

کہ اسے زہر دے کر مار اگیا۔ بہر حال ۱۳۱ طرح ان دو بھائیوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ جو ایک خاصے طویل عرصہ تک دلّی کے تخت و تاج کے عملاً مالک بنے رہے اور یکے بعد دیگرے مغل شاہزادوں کو شاہ شطرنج کی طرح ہندوستان کی سیاست کی بساط پر اپنی مرضی اور ضرورت کے مُطابق نچاتے رہے۔

محمد شاہ کے راستہ سے دو بڑے کانٹے نکل گئے تھے لیکن جاٹوں اور روہیلوں کی سرکشی برابر جاری تھی اور قطع نظر اس خلش کے جو اُن کی وجہ سے محمد شاہ برابر محسوس کرتا رہا، ان کے پے در پے فسادات سے امورِ سلطنت میں آہستہ آہستہ خلل پڑنے لگا۔ جاٹ خاص طور پر آگرہ کے صوبہ میں طاقت حاصل کر رہے تھے۔ شہنشاہ کی بے بسی اور مرکز کی کمزوری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ یہ صوبہ دارالخلافہ سے کس قدر قریب تھا اور کس آسانی سے انتظامِ حکومت کیلئے دلّی سے مشورہ اور کمک بھیجی جاسکتی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ لائق اور ہوشیار سپاہیوں کے ساتھ قابلِ اعتماد اور مخلص امرا کا بھی قحط الرجال ہو گیا۔ پرانی آنکھیں دیکھنے والوں میں ایک بوڑھا نظام الملک باقی رہ گیا، لیکن پے درپے سازشوں نے اسے بھی بد دل کر دیا اور اس نے یہ سمجھ لیا کہ اب دلّی کی سلطنت کے بُرے دن قریب آ گئے ہیں۔ چناں چہ وہ اپنے صوبہ دکن چلا گیا۔

اسوقت دلّی میں عمّالِ حکومت کی جو حالت تھی اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے جسے مورخین نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ایک قصاب خان محمد نام بادشاہ کے دودھ شریک بھائی کوکا خاں کی ملازمت میں تھا عام طور پر لوگ اسے 'خان' کہا کرتے تھے وہ دراصل چوروں اور ڈاکوؤں کے ایک بڑے گروہ کا سرغنہ تھا جس کا کام بڑے بڑے سرکاری عہدہ داروں، امرا، تجّار اور دوسرے شہریوں کے گھروں پر ڈاکہ ڈالنا اور ان کو قتل کرنا تھا، کتنے ہی آدمی انکے

ہاتھوں جان سے مارے گئے اور کتنے ہی زخمی ہوئے ، آخر کار محمد شاہ تک شکایت پہنچی اور شہر کوتوال کو ان امور کی تفتیش کے لئے فوری احکام صادر کئے گئے کوتوال نے عرض کیا کہ ان تمام واقعات کی ذمہ داری خان محمد اور اس کے گروہ پر ہے ۔ چنانچہ محمد شاہ نے خان محمد کی گرفتاری کا حکم دیا ۔ کوتوال نے جواب دیا کہ خان محمد کو سرکاری افسروں خاص طور پر کوکا خاں کی سرپرستی اور تائید حاصل ہے اور وہ خود بھی ایک طاقت ور پہلوان ہے ۔ اس لیئے کوتوال یا اس کے آدمیوں کا خان محمد پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہے ۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس شورہ پشت کی گرفتاری کا حکم خود شہنشاہ صادر کرے لیکن شہر کوتوال خود اس سے ڈرتا ہو ، وہ اور پُرامن شہریوں کے لیئے کتنا بڑا خطرہ ہوگا اور اس کی وجہ سے بستی میں امن وامان کا کیا حال ہوگا ۔ بہر حال کوتوال نے اس کی گرفتاری میں اپنی قطعی معذوری کا اظہار کیا اور معاملہ بظاہر رفت گزشت ہوگیا ۔ ایک دن کوکا خاں کے ہمراہیوں کے ساتھ خان محمد بھی محمد شاہ کے محل میں آیا ۔ بادشاہ کے دل سے بات نہ نکلی تھی ۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اسے گرفتار کر لیا جائے ۔ لیکن اس نے اپنی دیدہ دلیری سے فرار ہونے کی کوشش کی ۔ محل کے پہرہ داروں نے اسے گھیر لیا اور آخر کار وہ گرفتار کر لیا گیا ۔ بعد میں اسے کوتوالی کے سپاہیوں کے حوالہ کر دیا گیا ۔ جب کوتوال اسے خوب مار پیٹ چکا تو شہر کی چوریوں کا بہت کچھ مال اور بیس ہزار روپیہ نقد اس کے مکان سے برآمد ہوئے ۔ اس کے بعد جب اس پر مزید سختی کی گئی تو اس نے اپنی جماعت کے اور شریکوں کا بھی پتہ بتایا ، ان میں ایک محمد غوث تھا ، یہ شاہی ملازم تھا اور علاوہ معقول جاگیر کے اسے پانچ سو کا منصب بھی عطا ہوا تھا ۔ اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا اور ان بڑے بڑے سرکاری عہدہ داروں کا پتہ دیا جو اس گروہ میں شامل اور ان وارداتوں میں شریک تھے اور جو چوروں ، ڈاکوؤں اور

قاتلوں کو پناہ دیکر ان سے اپنا حصہ لیتے تھے اور وقت ضرورت انھیں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔

محمد شاہی عہد میں چند اور ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے سیاسی اور سماجی انتشار کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ایک جوتہ فروشوں کا ہنگامہ تھا جو محمد شاہ کے عہد کے گیارھویں سال پیش آیا۔ شعبان کا مہینہ تھا۔ ۸ رشعبان مطابق ۸ رمارچ ۱۷۲۹ء کی شام کو سبھ کرن نامی ایک جوہری جس کا تعلق شاہی توشہ خانہ سے تھا حافظ خدمت گار خاں داروغہ توشہ خانہ کے مکان سے واپس آرہا تھا، یہ حافظ خدمت گار خاں نواب روشن الدولہ پانی پتی کے منظور نظر تھے جنکی سفارش سے ان کو شاہی منصب اور داروغہ کا عہدہ مل گیا تھا سبھ کرن کی سواری چوک سعد اللہ خاں کے قریب سے گزری، اس علاقہ میں سڑک کے دونوں طرف پنجابی جوتہ فروشوں کی دوکانیں تھیں۔ یہ تمام لوگ دیندار مسلمان تھے اور اپنی کاروباری حیثیت کے علاوہ مذہبیت کے لئے بھی عام طور پر مشہور تھے منشی سبھ کرن کی پالکی جب ادھر سے گزر رہی تھی تو لوگ آتش بازی چھوڑ رہے تھے۔ اتفاق سے آتش بازی کی چنگاری پالکی کے اندر چلی گئی اور سبھ کرن کے طلائی خلعت پر جا پڑی۔ سبھ کرن کے ہمراہیوں کو قدرتی طور پر یہ حرکت ناگوار گزری اور نرم گرم گفتگو سے گزر کر مار پیٹ تک نوبت پہنچی۔ سبھ کرن کے خدمتگار تعداد میں تھوڑے تھے۔ جوتہ والوں نے انھیں مارا پیٹا اور ان میں سے ایک کی تلوار چھین لی، اور یہ لوگ نہایت غم و غصہ کی حالت میں وہاں سے چلے گئے۔ مکان پر پہنچکر سبھ کرن کا غصہ اور تیز ہوا اور جس آدمی کی تلوار چھینی گئی تھی اس نے اسے حکم دیا کہ واپس جاکر تلوار لائے اور جس نے یہ حرکت کی تھی اسے سخت سزا دے چنانچہ وہ شخص اپنے بہت سے ساتھیوں کو جمع کرکے جوتہ والوں کے محلہ میں گیا اور ایک لڑکے

کو پکڑ کر بہت مارا، اس کے شور اور واویلے کو سنکر ایک معمر شخص حاجی حافظ نام
اسے بچانے کے لئے دوڑا، لیکن سبھ کرن کے آدمیوں نے اس پر بھی تلوار سے حملہ
کیا اور وہ ہلاک ہوگیا۔ یہ دیکھ کر سبھ کرن کے آدمی تو بھاگ گئے لیکن سارا محلہ جمع
ہوگیا۔ صبح ہوتے ہوتے جوتے والے اور ان کے ساتھ سارے شہر کا مجمع لاش کے
چاروں طرف آپہنچا۔ لاش کو اُسی حالت میں ایک چارپائی پر رکھا گیا اور مجمع
دین! دین! کے نعرے لگاتا ہوا سبھ کرن کے مکان تک پہنچ گیا۔ سبھ کرن اس
ہنگامہ کی خبر سنکر پہلے ہی نکل گیا تھا اور شیر افگن پانی پتی خانساماں کے یہاں
پناہ لے رہا تھا۔ مجمع نے شیر افگن سے مطالبہ کیا کہ سبھ کرن کو حوالہ کر دو، لیکن
ایک تو اس بنا پر کہ سبھ کرن اس کے ماتحت ملازمین میں تھا اور دوسرے وہ اس
کے عزیز اور دوست روشن الدولہ کا منظور نظر تھا اسے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا،
چنانچہ سارا مجمع محل کی طرف چل پڑا۔ محمد شاہ کے سامنے پہنچکر ان لوگوں نے دین!
دین! اور انصاف! انصاف! کے نعرے لگانے شروع کئے۔ محمد شاہ
نے قمر الدین خاں وزیر کو حکم دیا کہ مجرم کو فوراً گرفتار کیا جائے۔ لیکن شیر افگن نے
اس شاہی حکم کی تعمیل سے بھی قطعاً انکار کر دیا، اور اس طرح پورا دن گزر گیا۔
اور لاش دفن نہ ہوسکی۔ دوسرے دن جمعہ تھا، جوتے والوں نے شہر میں ایک
جلوس نکالا اور تمام مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تاکہ اسلام اور
مسلمانوں کا تحفظ ہوسکے۔ مجمع شاہی مسجد میں داخل ہوگیا اور نماز جمعہ کیوقت
تک مسجد کا صحن لوگوں سے بھر گیا۔ لیکن آنے والوں کا ایسا تانتا بندھا تھا کہ ختم
ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ آخر اتنی بھیڑ ہوگئی کہ نماز اور خطبہ میں خلل آنے لگا۔ مجمع
میں سے بعض لوگ منبر کے قریب پہنچ گئے۔ قاضی پر گالیوں، گھونسوں اور جوتوں
کی بوچھار ہونے لگی اور اسے اس کے بیٹے سمیت منبر سے گھسیٹ کر اُتار لیا گیا

اس ہنگامہ کی خبر جب محل میں پہنچی تو بادشاہ کے حکم سے وزیر اور روشن الدولہ اپنے سپاہیوں کو لیکر امن بحال کرنے کے لئے پہنچے۔ وزیر نے مسجد میں داخل ہوکر مجمع کو خاموش کرنا چاہا اور کہا کہ انصاف کیا جائیگا۔ مجمع کچھ قابو میں آچلا تھا کہ روشن الدولہ اور پھر شیر افگن خاں مسجد میں داخل ہوئے اور انھیں دیکھ کر مجمع پھر قابو سے باہر ہوگیا ہر طرف سے جوتوں، پتھروں کی بارش ہونے لگی جس کی زد میں سب سے زیادہ شیر افگن اور پھر روشن الدولہ تھے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر ان دونوں امیروں کے سپاہی تلواریں لیکر مجمع پر ٹوٹ پڑے۔ عین اس وقت مسلح فوجی سپاہیوں نے عوام کا ساتھ دینا شروع کیا۔ یہ لوگ اپنے پورے ساز و سامان سے آراستہ تھے اب ہنگامہ بڑھ گیا اور سخت خونریزی ہوئی۔ شیر افگن خاں زخمی ہوا اور اسی حالت میں اس کے سپاہی بمشکل اس کو وہاں سے نکال کر لے گئے۔ اور اسکے جانے کے بعد روشن الدولہ کو بھی اسی حالت میں وہاں سے نکالا گیا۔ مجمع نے قمر الدین خاں وزیر کو اسلام اور مسلمانوں کا حامی اور محافظ قرار دیا۔ اور اس ہنگامہ کی تفصیلات شہنشاہ کو بھیجی گئیں۔ اس نے وزیر کے تدبر کی بڑی تعریف کی۔ منشی سبھ کرن کی حویلی ڈھا دی گئی اور جوتے والوں نے حاجی حافظ کی لاش وہاں دفن کرکے اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کر لی۔ یہ ہنگامہ بظاہر ایک معمولی سی بات پر شروع ہوا تھا لیکن جو نوعیت اس نے اختیار کر لی اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ شہر کے نظم و نسق کا کیا حال ہوچکا تھا اور کس طرح معمولی عہدہ دار بھی شاہی احکامات کی تعمیل سے انکار کردیتے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ شاہی محل کے سایہ میں معمولی باتوں پر اتنے بڑے بڑے ہنگامے برپا ہوجاتے تھے اور شاہی فوج بجائے نظم قائم رکھنے کے خود ان میں شریک ہوجاتی تھی۔

محمد شاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ شروع سے آخر تک اسکے گرد و پیش

ایسے لوگ تھے جو نہایت ادنیٰ کردار کا مظاہرہ کرتے تھے، ان کی وجہ سے ایک طرف خود بادشاہ کا رہا سہا وقار کم ہو رہا تھا اور دوسری طرف شرفا، اہلِ علم و فن اور اربابِ فضل و کمال نے سمجھ لیا تھا کہ ان کی قدر و منزلت کا دور ختم ہو گیا اور رذیلوں اور کمینوں کی سرپرستی کا زمانہ آگیا۔ آگے چل کر ہم بار بار شعرا کے کلام میں اس کا رونا پاتے ہیں اور جس قدر شہر آشوب لکھے گئے ہیں ان سب کی تان اسی پر ٹوٹتی ہے۔ محمد شاہی دور میں جن لوگوں کو فروغ حاصل ہوا ان میں ایک عورت رحیم النسا تھی بعض لوگ کہتے ہیں محمد شاہ سے اس کے جنسی تعلقات تھے لیکن یہ غالبًا صحیح نہیں ہے۔ رحیم النسا کا باپ جان محمد ایک رمّال تھا جو پرانی دلّی کا رہنے والا تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔ اس کی گزر اوقات رمّالی پر تھی۔ آہستہ آہستہ رحیم النسا نے محل میں اپنا عمل دخل پیدا کیا اور محمد شاہ کی والدہ نواب قدسیہ بیگم اس کی معتقد ہو گئیں۔ آخر میں اس کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ دربار کی سیاسی بساط پر وہ ایک اہم مہرہ بن گئی۔ شاہی مُہر اس کے قبضہ میں رہتی تھی اور دربار سے صادر ہونے والے تمام فرمانوں پر وہی اس مہر کو ثبت کرتی تھی۔ نظام الملک کو وزیر بنایا گیا تو اس نے بڑی مخالفت کی اور جب محمد خاں بنگش مالوہ کے صوبہ دار مقرر ہوئے تو انھوں نے اسے ایک لاکھ روپے کی رشوت پیش کی۔ رحیم النسا کے حواریوں میں ایک شخص حافظ خدمتگار خاں تھا جس کا ذکر اس سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ خدمتگار خاں کا زوال ہوا تو اس کے متوسلین بھی پکڑے گئے۔ ان میں خوشحال چند کایستھ بھی تھا، لوگوں کو شبہ تھا کہ خدمتگار نے ناجائز ذرائع سے جس قدر رشوت جمع کی تھی اس کا سارا حال خوشحال چند کو معلوم تھا۔ چنانچہ اس کا اقبال کرانے کے لئے اس پر طرح طرح سے سختی کی گئی، آخر میں اس پر شکاری کتے چھوڑ دیئے

گئے جنھوں نے اس کے جسم پر سے گوشت اُتار لیا اور تب ہی ان نے اُس رقم کی نشاں دہی کی جو خدمتگار نے جمع کی تھی۔

اسی طرح ایک اور شخص شاہ عبدالغفور تھا جو دراصل ٹھٹھہ کا رہنے والا تھا اور خود کو سیّد کہتا تھا لیکن بعض مورخین کے بقول جولاہہ تھا۔ کچھ ضعیف العقیدہ لوگوں کا خیال تھا کہ شاہ صاحب کے قبضہ میں جن ہے اور وہ لوگوں کو تعویذ گنڈہ بھی دیتا تھا اور اس طرح آہستہ آہستہ اس کی شہرت پھیلی اور وہی قدسیہ بیگم جس نے رحیم النسا، کو سر چڑھایا تھا، شاہ عبدالغفور کے عروج کا بھی ذریعہ بنی وہ محل میں آنے جانے لگا اور اس کا اثر اتنا بڑھا کہ بعض مورخین کے بقول اس کی روزانہ آمدنی کوئی پانچ ہزار روپیہ تھی۔ رشوتیں اس کے علاوہ تھیں۔ شاہ صاحب کا کاروبار چلتا رہا لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنے ساتھیوں کیتا ع " غافل بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" پر عمل شروع کر دیا۔ یہ لوگ جس طرح چاہتے، رنگ رلیاں مچاتے اور جس کو چاہتے ذلیل کر دیتے بلکہ جسے چاہتے مار ڈالتے اور ان سے کوئی پرسش نہ کرتا۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتیں جن میں عبدالغفور خود ناچتا گاتا۔ راہ چلتے پالکیاں روک لی جاتیں اور ان میں سے شریف عورتوں کو نکال کر شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا اور جنھیں وہ پسند کرتے انھیں ان کی خدمت کے لئے روک لیا جاتا۔ تقریباً بارہ سال تک عبدالغفور کو یہ عروج حاصل رہا لیکن ایک دن اس کے زوال کا بھی مقرر تھا۔ اس پر سرکاری مالیات میں خرد برد کا الزام ثابت ہو گیا اور اندازہ لگایا گیا کہ اس نے کم از کم ساٹھ لاکھ روپے کی بد دیانتی کی ہے۔ جب مزید تفتیش ہوئی تو اس سے تین کروڑ روپے کی حساب فہمی کی گئی۔ اب اس پر سختی شروع ہوئی تو اس نے بیس لاکھ کی رقم ادا کی لیکن بقایا کے مطالبہ پر حضور شہنشاہ کے لئے نہایت نازیبا کلمات کہے۔ چنانچہ اسے گرفتار کر کے قید کر دیا

گیا اور چار سال اسی حالت میں رہ کر اس کا انتقال ہوگیا۔

یہ حالات تھے کہ نادر شاہ بلائے آسمانی بنکر بساط سیاست پر نمودار ہوا نادر کی ولادت ۱۶۸۸ء میں ہوئی۔ اس کا باپ امام قلی افشار قبیلہ کا ایک غریب ترکمان تھا جو پوستین اور کلاہ بنا کر گزر اوقات کرتا تھا۔ نادر نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام بڑی جدوجہد اور کش مکش میں گزارے۔ ازبک قبیلہ کے چند لٹیرے اُسے زبردستی قیدی بنا کر لے گئے اور چار سال اس نے ان کی قید میں گزارے' وہاں سے رہا ہوا تو ایک آزاد سپاہی کی زندگی شروع کی۔ اس زمانہ میں افغانوں نے ایرانی سلطنت پر قبضہ جما رکھا تھا۔ نادر نے آہستہ آہستہ اپنی طاقت بڑھائی اور آخر کار نیشا پور پر قبضہ کر لیا۔ شاہ طہماسپ نے اسے پسند کیا اور ۱۷۲۶ء میں نادر شاہی ملازمین میں داخل ہوگیا، اراکین سلطنت نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ سلطنت کو سنبھالنے کے لئے طہماسپ جیسے کم زور انسان کی جگہ نادر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ۱۷۳۲ء میں طہماسپ کو تخت سے اتار دیا گیا اور اس کا بیٹا عباس جو صرف آٹھ مہینے کا تھا نادر کی نگرانی میں تخت پر بٹھا دیا گیا۔ چار سال بعد عباس کا انتقال ہوگیا اور ۱۷۳۶ء میں نادر شہنشاہ نادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا اس کے بعد اس نے ترکوں سے آرمینیا اور جارجیا لے لیا اور روسیوں سے دوستی کر لی۔ پھر ۱۷۳۷ء میں اس نے اسی ہزار آدمیوں کو لیکر قندھار پر حملہ کیا۔ قندھار کا افغان حاکم قلعہ میں محصور ہوگیا اور تقریباً ایک سال تک محاصرہ جاری رہا جس کے بعد بالآخر قلعۂ قندھار فتح ہوگیا۔ نادر نے قلعہ اور شہر کو مسمار کر کے وہاں نادر آباد کے نام سے ایک دوسرا شہر بسایا۔ اسی حملہ کے دوران میں نادر شاہ نے پے در پے تین ایلچی ہندوستان روانہ کئے تاکہ جو سپاہی قندھار سے فرار ہوں انھیں کابل کا مغل صوبہ دار پناہ نہ دے، محمد شاہ نے دو ایلچیوں کو اس وعدہ

کے ساتھ واپس کر دیا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے صوبہ دار کو مناسب ہدایات جاری کر دے گا لیکن جب قندھار کا محاصرہ جاری تھا تو کچھ لوگ ایران کی سرحد پار کر کے مغلوں کی سرحد میں داخل ہو گئے، نادرشاہ نے ایک اور ایلچی دلی روانہ کیا اور اسے حکم دیا کہ چالیس دن کے اندر واپس آجائے۔ لیکن اسے تقریباً ایک سال ہو گیا اور کوئی مناسب جواب نہ ملا۔ آخر نادرشاہ نے اسے ہدایت بھیجی کہ وہ فوراً واپس چلا آئے کیونکہ معاملات بقول نادر اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ اسے خود ہندوستان کا رخ کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس وقت کابل کی صورتِ حال بیان کرتے ہوئے مورخ غلام حسین لکھتا ہے :-

"نہ تو صوبہ دار اور نہ خود امیر الامرا کو خبر تھی کہ سرحدی درول اور سڑکوں کا کیا حال ہے۔ راستوں پر معمولی محافظ دستے بھی موجود نہ تھے حکومت کی کمزوری کا نتیجہ یہ تھا کہ مقامی عہدہ داروں کو جواب طلبی کا کوئی ڈر نہ رہا تھا اور نہ کوئی ماتحت عہدیدار اپنے افسران بالا سے ہدایات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان سرحدی چوکیوں سے جو چاہتا اور جس طرف چاہتا بے روک ٹوک آجا سکتا تھا۔ شہنشاہ اور اس کے امرا کے کان تک یہاں کی خبریں نہیں پہنچتی تھیں اور نہ وہ خود ہی یہ دریافت کرنے کی زحمت گوارا کرتے تھے کہ آخر ان دور دراز صوبوں سے حسبِ معمول روزانہ خبروں کے پرچے کیوں نہیں آتے۔ کابل کا گورنر بار بار اپنے سپاہیوں کو تنخواہ تقسیم کرنے کے لئے دارالخلافہ سے روپیہ طلب کرتا تھا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ سپاہیوں کے پاس سازو سامان نہ رہا تھا، نہ ان کے بدن پر وردی اوڑھان کے اوران کے اہل وعیال کے کھانے کو روٹی ملتی تھی، وہ برابر صوبہ دار سے تنخواہ کا مطالبہ کرتے رہتے تھے"

صوبہ دار کو دلی سے جو جواب ملتا تھا اسے انندرام کی زبانی سنئے :-

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس قدر احمق ہوں جو تمھاری اس داستان سے متاثر ہو جاؤں۔ ہم لوگ میدانوں کے رہنے والے ہیں اور صرف اسی چیز سے ڈرتے ہیں جو ہمارے قریب ہو اور جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، تمھارے مکانات پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہیں، شاید تم نے منگولوں اور قزلباشوں کی فوجوں کو اپنے مکانوں کی چھتوں پر سے دیکھ لیا ہے، اپنے آقا کو بتا دو کہ ہم نے بنگال کے گورنر کو روپیہ کی فراہمی کے لیئے لکھدیا ہے اور برسات کے بعد جب بنگال سے روپیہ آجائے گا تو فوراً کابل بھیجدیا جائے گا۔"

اس جواب پر تبصرہ کرتے ہوئے انندرام لکھتا ہے کہ اگر افغانوں کی بر وقت مدد کی جاتی اور انھیں سرحد کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا جاتا تو وہ اپنی روایتی شجاعت سے ایرانی فوج کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکے رہتے یہاں تک کہ دلی سے کمک آجاتی اور شاید ہندوستان اس تباہی سے بچ جاتا جو اُسے نصیب ہوئی"۔ لیکن نہ تو ضروری روپیہ اور سازوسامان بھیجا گیا اور نہ ہی فوجوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے مرکز سے مزید کمک روانہ کی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی سی مزاحمت کے بعد کابل کا قلعہ فتح ہو گیا۔ کابل کے خزانے میں جو کچھ نقدی باقی تھی وہ سب نادر کے ہاتھ لگی اور سازوسامان میں ہاتھی اور گھوڑے بھی ملے، اس کے بعد نادر نے محمد شاہ کو ایک خط لکھا جس میں ایران اور افغانستان کی حالت کا ذکر کیا گیا تھا کہ افغانوں نے ایران سے زیادہ ہندوستان کو نقصان پہنچایا تھا۔ جو ایلچی یہ خط لیکر دلی جا رہا تھا اسے جلال آباد کے مقام پر روک لیا گیا اور واپس جانے پر مجبور کیا گیا۔ یہ گفت وشنید ہو ہی رہی تھی کہ ایک مقامی سردار نے اس ایلچی اور اس کے ساتھیوں کو لوٹنے کے بعد ہلاک کر دیا۔ اس ذلت کو نادر شاہ برداشت نہ کرسکا، چنانچہ اس کی فوج ایک ہی دم میں جلال آباد پر

جاٹوتی۔ جس سردار نے یہ حرکت کی تھی اس کے قلعہ کو مسمار اور تمام مردوں کو ہلاک اور عورتوں کو جن میں اس کی بہن اور بیویاں بھی تھیں قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد فوج نے دلی کا رخ کیا۔ ۶ر نومبر ۱۷۳۸ء کو یہ یلغار شروع ہوئی۔ فوج کے ہراول ۶ دستوں میں بارہ ہزار سوار تھے۔ ۶ ہزار سوار خیموں کی حفاظت کے لئے علیحدہ تھے، پشاور میں ناصر خاں گورنر تھا۔ اس نے تقریباً بیس ہزار افغان جمع کئے نادری فوج کا پہلا معرکہ درہ خیبر میں ہوا، لیکن افغانوں کو پسپا کر کے نادر شاہ بغیر کسی خاص مزاحمت کے پشاور میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد لاہور کی باری تھی یہاں کا صوبہ دار زکریا خاں تھا اسے یہ امید تو تھی نہیں کہ دلی سے کوئی مدد پہنچے گی اس لئے خود اس سے جو ہو سکا اس نے کیا۔ لاہور سے تیس میل شمال کی طرف امین آباد کے مقام پر اس نے قلندر خاں کی کمان میں پانچ ہزار آدمی اس سیلاب کو روکنے کے لئے بھیجے اور خود کوئی بارہ ہزار فوج لیکر شاہدرہ کے پل کے قریب ٹھہر گیا، یہ کمزور جماعت اس طوفان کی تاب نہ لا سکی اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد زکریا خاں نے نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر قلعہ کی چابیاں اس کے حوالہ کر دیں۔ نادر نے اسکی بڑی عزت اور توقیر کی اور تقریباً سولہ دن لاہور میں گزار کر آگے بڑھا۔ شیخ علی حزیں جو اس وقت لاہور سے سرہند جا رہے تھے اسوقت کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سارے صوبہ میں ایک انقلاب برپا تھا۔ ہر شخص لوٹ "قتل و غارت گری پر آمادہ ہو گیا تھا، راہزن سڑکوں پر بیباک گھومتے پھرتے تھے۔ نہ گھر میں کوئی محفوظ تھا نہ سفر میں"

نادر شاہ لاہور سے بڑھ کر کرنال تک پہنچ گیا اور محمد شاہ اور اس کے درباری خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے۔ امرا کو ایک عذر یہ بھی تھا کہ رمضان کا مبارک مہینہ آگیا تھا اور ایسی صورت میں فوجیں کس طرح روانہ کی جا سکتی تھیں۔ دراصل یہ

سب آنے والی مصیبت کو جہاں تک ہو سکے ٹالنے کے بہانے تھے۔ آخر جب کوئی صورت نہ رہی تو محمد شاہ نے اپنے امراء میں سے اعتماد الدولہ نواب قمرالدین خاں، نظام الملک آصف جاہ اور امیر الامراء صمصام الدولہ کو اس مہم پر مامور کیا۔ اور ایک کروڑ روپیہ ان کے اخراجات کے لئے منظور کیا، لیکن فوج کی روانگی میں مزید تاخیر ہوئی اور دلی سے نکل کر شاہی لشکر پانی پت پہنچ کر رُک گیا اور اس کا انتظار ہونے لگا کہ شہنشاہ بذاتِ خود آکر شریک ہوں، چنانچہ ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ پھر یہ انتظار رہا کہ نواب سعادت خاں برہان الملک اودھ سے تیس ہزار سوار لے کر آجائیں۔ غرض اس طرف تاخیر ہوتی گئی اور نادری فوجیں بغیر مزاحمت اور مقابلہ کے آگے بڑھتی رہیں۔ نادری لشکر کی صحیح تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک عام اندازہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایک لاکھ ساٹھ ہزار آدمی تھے۔ شاہی لشکر کی کل تعداد پچھتر ہزار سے زیادہ نہ تھی، اس میں شہنشاہ کی بیگمات، ان کا عملہ، امرا کے خاندان اور ان کے متوسلین بھی تھے۔ اگر ان کی تعداد کو نکال دیں تو میدان میں لڑنے والے سپاہیوں کی گنتی اور کم ہو جاتی ہے۔ غرض پچھتر ہزار کے لشکر کا انتظام اس کی حفاظت اور رسد کی بہم رسانی بجائے خود ایک مسئلہ تھی۔ چنانچہ جب اصل معرکہ پیش آیا تو چار روز میں پورا ذخیرہ ختم ہو گیا اور پانچ روز فاقہ کرکے فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ صورت حال دیکھ کر شاہی فوج نے آگے بڑھنے کے بجائے کرنال پر مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں ناکام ہوئی۔ نادر کے درباری مورخ لکھتے ہیں کہ اس معرکہ میں تقریباً سو سردار اور تیس ہزار سپاہی کام آئے، ایرانی فوج کے کوئی ڈھائی ہزار آدمی مارے گئے۔ نادر شاہ سے صلح کے لئے گفت و شنید شروع ہوئی اور اس کام کے لئے نظام الملک کو منتخب کیا گیا، آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ نادر کی فوج پچاس لاکھ روپیہ تاوان لیکر لوٹ جائے گی۔ اس رقم میں سے

بیس لاکھ نقد موقع پر ادا کر دیئے جائیں گے۔ دس لاکھ لاہور پہنچنے تک اور باقی رقم کابل پہنچنے تک ادا ہو جائے گی۔ اس کے بعد نادرشاہ کی دعوت پر محمد شاہ اس کے خیمہ میں گیا اور بظاہر معاملات طے ہو گئے۔ لیکن یہاں ایک مرتبہ پھر دربار کی سازشوں نے اپنا رنگ دکھایا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ سعادت خاں نے نادرشاہ کو بتایا کہ پچاس لاکھ تاوان پر فیصلہ کرکے اس نے دھوکہ کھایا کیوں کہ اگر وہ دلی پہنچ جاتا تو کم از کم بیس کروڑ روپیہ نقد اور بیشمار زر و جواہر اس کے ہاتھ آسکتا تھا۔ نادرشاہ کی نیت بدل گئی اور اس نے نظام الملک کو دوبارہ طلب کرکے بیس کروڑ روپیہ کا مطالبہ کیا۔ نظام الملک حیران رہ گیا۔ اس نے جواب دیا کہ اپنی حکومت کی تاریخ میں خاندان چغتائی میں سے کبھی کسی نے بیس کروڑ کی رقم خزانہ میں نہیں دیکھی۔ زیادہ سے زیادہ رقم شاہجہاں کے عہد میں جمع ہوئی تھی اور وہ بھی سولہ کروڑ تھی، جسے بعد میں اورنگ زیب نے دکن کی مہم میں صرف کر دیا تھا اور محمد شاہ کے خزانہ میں پچاس لاکھ سے زیادہ نہ تھا۔ نادرشاہ نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ نظام الملک کو واپسی کی اجازت نہ ملی بلکہ شاہی خیموں کی بھی نگرانی ہونے لگی۔ شاہی لشکر کی شکست کی خبر دلی پہنچ چکی تھی لیکن حاجی فولاد خاں کوتوال نے بڑی کوشش سے امن و امان بحال رکھا۔ نادرشاہ نے سعادت خاں کو محمد شاہ کی طرف سے اور طہماسپ خاں جلائر کو اپنے ذاتی نمائندہ کی حیثیت سے دلی روانہ کیا۔ چنانچہ لطف اللہ خاں نے شہر کی چابیاں ان لوگوں کے حوالہ کر دیں۔ اس کے بعد نادرشاہ اور محمد شاہ دلی کے لئے روانہ ہوئے۔ پہلے محمد شاہ شہر میں داخل ہوا، لیکن اس تجمل اور شان و شوکت کا نشان نہ تھا جو شہنشاہ کے شہر میں داخل ہونے پر نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک مختصر سی جماعت تھی اور وہ خود ایک معمولی تخت رواں پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے افسردگی کے آثار

نمایاں تھے ، نہ باجے بج رہے تھے اور نہ پرچم لہرا رہے تھے ، چند سردار اس کے ساتھ تھے اور معلوم ہوتا تھا کوئی سوگواروں کا قافلہ آہستہ آہستہ چلا آ رہا ہے۔ دوسرے دن نادر شاہ شہر میں داخل ہوا اور اس کا بڑی تزک و احتشام سے استقبال کیا گیا۔ سعادت خاں جس نے نادر کو بیس کڑوڑ روپیہ کا سبز باغ دکھایا تھا عجیب مشکل میں پھنس گیا۔ نادر نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ اگر اتنی رقم نہ ملی تو وہ ذاتی طور پر اس کا ذمہ دار ہوگا۔ سعادت خاں کو اور کوئی راستہ تو نظر نہیں آیا اس نے گھر جا کر زہر کھا لیا۔

نادر شاہ محل میں مہمان تھا اور اس کے سپاہی بازاروں اور سڑکوں پر آزاد گھوم رہے تھے کہ کسی نے یہ افواہ اڑا دی کہ محمد شاہ کے اشارہ پر ایک قلماقنی نے نادر شاہ کو ہلاک کر دیا۔ افواہ پورے شہر میں پھیل گئی اور اہالیان شہر نے نادری سپاہیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ ایک تو یہ لوگ تعداد میں کم تھے۔ دوسرے دلّی کی سڑکوں اور گلیوں سے واقف نہ تھے، نہ وہ یہاں کے لوگوں کی زبان سمجھتے تھے اور نہ لوگ ان کی زبان جانتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات بھر یہ قتل عام جاری رہا۔ بلکہ سلسلہ دوسرے دن صبح تک چلا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ شہر والوں کے غصّہ کا اصلی سبب نادری سپاہیوں کی لوٹ مار اور ظلم وستم تھا، لیکن بظاہر یہ الزام غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ نادر کو دلّی میں داخل ہوئے ایک دن سے زیادہ نہیں گزرا تھا۔ اس لئے بیشتر مورخین ہندوستانی عوام کو ہی اس ہنگامہ کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ علی حزیں کے بیان کے مطابق سات ہزار اور عبدالکریم کے بقول تین ہزار ایرانی سپاہی مارے گئے۔ نادر کو جب اس کی اطلاع ملی تو پہلے اسے یقین نہ آیا، لیکن جب ایسے حالات معلوم ہوئے تو اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے مقامات پر جمے رہیں، صبح کو وہ خود باہر نکلا، نادری سپاہیوں کا

قتل جاری تھا۔ صحیح صورت حال کا اندازہ لگانے کے بعد وہ روشن الدولہ کی سنہری مسجد میں بیٹھ گیا اور تلوار نیام سے نکال لی۔ یہ گویا قتل عام کا اعلان تھا۔ اب تک ایرانی سپاہی اس کے حکم کی تعمیل میں خاموش تھے، اب انہوں نے دل بھر کر بدلہ لیا۔ مکان جلائے گئے۔ محلّے کے محلّے ویران ہو گئے۔ بچے، جوان، بوڑھے، مرد، عورتیں بے دریغ تہ تیغ ہوئے۔ یہ قتل عام صبح نو بجے سے شروع ہوا اور دوپہر کے دو بجے تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ محمد شاہ نے نظام الملک اور دوسرے وزیروں کو بڑی عاجزی کے ساتھ اسے بند کرانے کی درخواست لیکر بھیجا۔ چنانچہ نادر نے حکم دیا کہ بس تلواریں نیام میں کر لی جائیں۔ اس قتل عام میں کام آنے والوں کی تعداد مورخین نے پچاس ہزار سے بیس ہزار تک بتائی ہے۔ ؟

نادر شاہ نے دلّی میں دو مہینے گزارے اور تاوان جنگ وصول کرنے کا انتظام کرتا رہا۔ نادر کے ہاتھ جو دولت لگی اس کا اندازہ بعض مورخین کے نزدیک ستر کروڑ، اور بعض کے نزدیک پندرہ کروڑ ہے۔ اس کے علاوہ تین سو ہاتھی دس ہزار گھوڑے، بے شمار اونٹ بھی تاوان میں شامل تھے اور اس طرح ۵ مئی ۱۷۳۹ء کو دلّی میں ستاون دن کے قیام کے بعد نادر لوٹ گیا۔ لیکن دلّی کو ایسا چھوڑ گیا جیسے کوئی بیوہ جس کا سہاگ لٹ گیا ہو اور اس طرح اس خرابی کی بنا پڑی جو پھر کبھی شرمندۂ تعمیر نہ ہو سکی۔

یہ حالات اور واقعات تھے جنھوں نے محمد شاہی عہد اور اس کے بعد کے شعراء سے شہر آشوب لکھائے۔ اس سلسلہ میں شاہ حاتم، سودا، میر، نظیر اکبرآبادی اور مصحفی کا کلام خاص طور پر ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ ان میں سے بعض شہر آشوب تاریخی اعتبار سے اس زمانے کے بعد کے ہیں جس کا ہم جائزہ لے چکے ہیں لیکن جس عام ملکی ماحول کی یہ ترجمانی کرتے ہیں وہ بالکل وہی ہے جسے ہم تاریخ کی کتابوں میں محمد شاہ کے

عہد سے پہلے اور اس کے بعد تک پاتے ہیں۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی شاہ حاتم کا شہر آشوب ہے۔

اس شہر آشوب میں اُسی منظر کی جھلک دکھائی ہے جس کی تفصیل اُوپر آچکی ہے۔ شرفا اور اہل علم و فن کی قدر دانی مفقود تھی، ان کی جگہ ارباب نشاط نے لے لی تھی، لوگوں کے اخلاق تباہ ہو چکے تھے، محبت و خلوص کا پتہ نہ تھا۔ خود غرضی اور سازش کا دور دورہ تھا لوگوں کو ذہنی سکون میسّر نہ تھا۔

اسی سلسلہ میں سوؔدا کا وہ مشہور شہر آشوب بھی آجاتا ہے جو اردو شاعری میں ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے جو واقعات مورخین نے بیان کئے ہیں انھیں سوؔدا نے اس خوبی سے لکھا ہے گویا سب کچھ اس کا چشم دید ہے، اس کے چند نمونے دیکھئے:-

کہا یہ آج میں سوؔدا سے کیوں ہے ڈانوا ڈول
پھرے ہے جا بجا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے کہ اس کا جواب ہیں دو بول
اگر کہوں میں تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے ہیں نوکر امیر دولت مند
بر آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبہ کا خاوند
رہی نہ اُس کے تصرف میں فوجداری کول

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف
ٹکے کہاں جو ہیں دیکھے ہوں انہوں کے حریف
نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیانِ خریف
جو عامل ہینگے محالات پر سو یوں ہیں ضعیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر کسو کی اول

پس از کا ملک میں کار نسق جو یوں ہو تباہ
کہ کوہ زر ہو زراعت میں تو نہ دیں پر کاہ
جگہ وہ کونسی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ
کہاں سو آئیں پیادے کریں جو بیٹھ نگاہ

کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

رہے فقط عربی باجے پر انھوں کے نشاں　　جو چاہو او سکو نہ بجوا دیں یہ تو کیا امکاں
پر ان کو فکر ہے تخفیف خرچ کی ہر آں　　رہے گا حال اگر ملک کا یہی تو ندال
گلے میں طاشا کہاروں کے ہاتھ میں ہے ڈھول

انھیں ہے اپنی امارت سے اب یہی منظور　　کہ ہوں دو مور چھل اور ایک کا نبی ہو سمور
نہ رسم صلح کی سمجھیں نہ جنگ کا دستور　　جو اُن میں قاعدہ داں تھے ہوئے وہ ایسے دُور
تماش ان کی طبیعت کا سب طرح سے ٹھٹھول

امیر اب جو ہیں دانا اونھوں کی ہو یہ چال　　ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھکر زمانہ کا حال
بچھی ہو سوزنی، خو جا کھڑا ہو جھلے ہو رُمال　　حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہلِ کمال
دھری ہے گرد بُرد ایک پیکدان بھی خوشڈول

جو کوئی ملنے کو گاہے انھوں کے گھر آیا　　ملے یہ اوس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اسمیں جو درمیاں آیا　　اونھوں نے پھیر کے اودھر کو مونہہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

جو مصلحت کے لئے جمع ہوں صغیر و کبیر　　تو ملک و مال کی فکر اس طرح کریں ہیں مشیر
وطن پہنچنے کی سوجھے ہے بخشی کو تدبیر　　کھڑا یہ تکتا ہے دیوانِ خاص بیچ وزیر
کہ شامیانہ کے بانسوں پہ روپے کے خول

پڑے جو کام اونھیں تب نکل یہ کمائی سے　　رکھیں وہ فوج جو مُوتے پھرے لڑائی سے
پیادہ ہو سو ڈرے سر مُنڈاتے نائی سے　　سوار گر پڑے سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

نہ صرف خاص میں آمدنہ خالصہ جاری　　سپاہی تا متصدی سبھوں میں بیکاری
اب آگئے دفترِ تنگی میں کیا کہوں خواری　　سوال دستخطی کو پھاڑ کرکے پنساری

کسی کو آنو لے ڈے باندھ کر کسی کو کنول

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دا   تلاش کر کے ڈھلیتی اُنہوں نے ہونا چا
ندان قرض میں بنیوں کے دی سپر تلوار   گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ ہتھیا
بغل کے بیچ تو سونٹا ہی ہاتھ میں کچکول

جو کوئی ہیگا کہیں زیر چرخ نیلی فام   جو جا بیدا دکا اوس کی ہے پرگنہ سر سام
وبا کا جیسکے ہے دار الخلافہ میں ہنگام   گھروں کی ضبطی کا رسم اس قدر ہوا ہی عام
ایدھر کسی کا دکھا سر ادھر سو دوڑے قول

سو کیا وہ نوکری کٹتی ہو جس میں یُوں اوقا   ملے ہے پیٹ کو روٹی سو رو رو آدھی را
جو چاہو تن ڈھکے اسمیں ہو آگے پیچھے ہاتھ   اور اوس پر یہ کہ وہ نت ٹھیری روز موجودا
جو پانچوں باندھئے ہتھیار اور بجھٹے لپتول

وہ نوکر اب جسے آتا ہر آن بہچانے   جو پُوچھو اون سے کہ تم کچھ روپے لگے پانے
کہے ہے آدو وہ بھر کر سوائے آنٹھ آنے   روپے کی شکل ہی دیکھی نہیں خدا جانے
کہ اس زمانے میں چپٹا بنے ہے یا وہ گول

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز   تو اوس کو سُن کے کریں ہوش جغد کے پرواز
نہیں وہ گھر سنو جس میں شغال کی آواز   کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہی بجز چراغ غول

کسی کے گھر نہ رہا آسیا سے تا بہ او جاغ   ہزار گھر میں سے اک گھر میں اب جلے ہی چراغ
سو کیا چراغ، وہ گھر ہی گھروں کے گھر سو داغ   اور اون مکانوں میں ہر سمت رینگتے ہیں اولاغ
جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھ کر ہنڈول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس   کہ جنکے دیکھتے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سو اُداس   بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑی مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم — نہ جانے کن نے کیا اس زمیں پہ مقدم شوم

جہاں تھے سرو و صنوبر اب اس جگہ ہے زقوم — مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم

گلوں کے بدلے جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

جہان آباد تو کب اس جفا کے قابل تھا — مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا

کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقش باطل تھا — عجب طرح کا یہ بحر جہاں یہ ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

سودا نے اس قصیدہ شہر آشوب میں اس معاشی بدحالی کا رونا رویا ہے جو ان حالات کے قدرتی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوئی تھی۔ خزانے میں روپے کی کمی تھی بلکہ انتظام خراب ہونے کے باعث عامل جاگیروں سے پوری رقم وصول نہیں کر سکتے تھے اور جو وصول کرتے تھے وہ جاگیرداروں اور منصب داروں تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جاتی تھی۔ سپاہیوں اور لشکریوں کو ان کی تنخواہیں نہیں ملتی تھیں، اس لئے وہ بددل تھے اور معاش کی دوسری صورتیں اختیار کرتے تھے۔ امراء کا حال یہ تھا کہ وہ سلطنت کے بارہ میں گفتگو کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ کوئی دوسرا یہ ذکر چھیڑتا تو کہتے کہ بھائی کچھ اور باتیں بول۔ غرض لوگوں کی سازشوں اور خود غرضیوں نے اس جہان آباد کو جس کی خاک سے خلق موتی رولتی تھی، مختصر سی مدت میں پامال کر کے رکھ دیا۔

سودا کے ایک اور قصیدہ کا عنوان تضحیک روزگار ہے جو بظاہر ایک گھوڑے کی ہجو ہے لیکن دراصل اس فوجی نظام پر ایک عبرت ناک تبصرہ ہے جس کے بل بوتے پر حکومت کا نظام قائم ہوتا ہے اور جو زوال کی اس مضحکہ انگیز حد تک پہنچ چکا تھا کہ میدان جنگ میں جانے والے گھوڑے کے پہیے لگانے، آگے سے دانہ دکھانے، اور پیچھے سے چابک لگانے کی ضرورت پیش آتی تھی اور جس کا سوار پہلے ہی معرکہ میں

بغل میں جوتی داب کر گھر کی راہ اختیار کرتا ہے۔

متقدمین میں جس صحت اور جزئیات نگاری کے ساتھ نظیر اکبر آبادی نے اپنے ماحول کی ترجمانی کی ہے اس کی مثال کہیں اور مشکل سے ملتی ہے۔ انھوں نے اپنی دنیا کا تماشا اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے :-

نہیں ہے زور جنھوں میں وہ کشتی لڑتے ہیں   جو زور والے ہیں وہ آپ سے پچھڑتے ہیں
جھپٹ کے اندھے بٹیروں کے تئیں پکڑتے ہیں   نکالے چھاتیاں کیڑے اکڑتے پھرتے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

بنا کے سیار رہا زر کی دکان بیٹھا ہے   جو ہنڈی وال تھا وہ خاک چھان بیٹھا ہے
جو چور تھا سو وہ ہو پاسبان بیٹھا ہے   زمین پھرتی ہے اور آسمان بیٹھا ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

زباں ہے جسکی اشارے سے وہ پکارے ہے   جو گونگا ہے وہ کھڑا فارسی بگھارے ہے
کلاہ ہنس کی کوّا کھڑا اُتارے ہے   اچھل کے مینڈک ہاتھی کے لات مارے ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

جو ہیں نجیب النسب کے وہ بندے چیلے ہیں   کمینے اپنی بڑی ذات کے نویلے ہیں
جو باز شکرے ہیں پا پڑ کھڑے وہ بیلے ہیں   بگھڑ تو مر گئے اُلو شکار کھیلے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

جنھوں کی ڈاڑھی ہے انکی تو بات واہی ہے   جو ڈاڑھی منڈے ہیں اُنکی سند گواہی ہے
سیاہی روشنی اور روشنی سیاہی ہے   اُجاڑ شہر میں مُردوں کی بادشاہی ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

جنھوں میں عقل نہیں وہ بڑے سیانے ہیں   جو عقل رکھتے ہیں وہ باولے دوانے ہیں
زنانے شوق سے مردوں کے پہنے بانے ہیں   جو مرد ہیں وہ بڑے ہیجڑے زنانے ہیں

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

جنھوں کے کان نہیں دور کی وہ سُنتے ہیں   جو کان والے ہیں بیٹھے وہ سر کو دُھنتے ہیں
دھوئیں برستے ہیں اور ابر تنکے چُنتے ہیں   کباب بھیگتے ہیں اور طیدے بُھنتے ہیں

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

خبیث دیو پلید آ ہر اک سے لڑتے ہیں   جو آدمی ہیں وہ سب انکے پاؤں پڑتے ہیں
بلائیں لیتے ہیں اور بھوت جن جھگڑتے ہیں   یہ قہر دیکھو کہ زندوں کے مُردے لڑتے ہیں

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

کِھلے ہیں آکھ کے پھول اور گلاب جھڑتے ہیں   بنولے بکتے ہیں انگور آم سڑتے ہیں
سخی کریم پڑے ایڑیاں رگڑتے ہیں   بخیل موتیوں کو موسلوں سے چھڑتے ہیں

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

عزیز تھے جو ہوئے چشم میں سبھی کے حقیر   حقیر تھے سو ہوئے سب میں صاحب توقیر
عجب طرح کی ہوائیں ہیں اور عجب تاثیر   اچنبھے خلق کے کیا کیا کروں بیاں میں نظیر

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

نظیر بڑی رنگیلی طبیعت کے آدمی تھے وہ خوش مزاج اور خوش باش تھے۔ میلوں ٹھیلوں، عرسوں، چھڑیوں اور راگ رنگ کی محفلوں میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ اُن کی قلندرانہ وضع اور زندہ دلی ان کے کلام سے ظاہر ہے، جب وہ ایسے خیالات ظاہر کرنے پر مجبور ہو جائیں تو حالات جس قدر خراب ہو چکے ہوں گے انکا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔[1]

ان سیاسی حالات اور درباری معاملات نے عوامی زندگی پر کیا اثرات ڈالے؟ اس کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں ایک مرتبہ پھر تاریخ کی کتابوں سے نکل شاعروں کے

---

[1] ایک ایسا ہی شہر آشوب مصحفی نے بھی لکھا ہے لیکن ان کی ولادت نادری حملہ کے بعد ہوئی اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ انھیں حالات کے مُطابق ہے جو ان کے زمانے تک اور خراب ہو گئے تھے۔

کلام کا جائزہ لینا پڑتا ہے جتھے بندیوں کا اثر اس درجہ بڑھ چکا تھا کہ ہم شعرا کو بھی اس سے محفوظ نہیں پاتے۔ مشاعروں نے مجادلوں کا رنگ تو لکھنؤ پہنچکر ہی اختیار کیا جہاں کی ایک جھلک انشاؔ اور مصحفی کے معرکوں میں ملتی ہے لیکن اس کی ابتدا دلّی میں ہوچکی تھی اور قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرہ مجموعہ نغز میں انشاؔ اور قدرتؔ اور عظیم کے جس معرکہ کا ذکر کیا ہے اس میں اس قسم کی جتھہ بندی کا صاف پتہ چلتا ہے۔ یہاں شاعرانہ چشمک شعر و شاعری سے گزر کر پھکڑپن اور پھر گالی گلوج تک پہنچ گئی جس میں شاعروں کے ساتھ ان کے مربی اور سرپرست دلّی کے شاہزادے بھی شامل ہوگئے۔ ظاہر ہے یہ فضا خاص طور پر ہجو نگاری کے لئے سازگار ہوسکتی تھی۔ چنانچہ اسی دور میں اُردو شاعری میں باقاعدہ ہجو نگاری کا آغاز ہوتا ہے ہجو ہجا اور طنز و ظرافت کی تاریخ ادب میں بڑی حیثیت ہے بالخصوص جب اس کا مقصد اصلاح و تزکیہ ہو اور اس کے محرکات ذاتی نہ ہوں۔ اعلیٰ درجہ کی طنز میں اعلیٰ قسم کی لطافت ہوتی ہے جو اس کی حدوں کو مزاح اور ظرافت سے ملا دیتی ہے لیکن جہاں شاعر ذاتیات میں اُلجھ کر رہ جائے اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو شاعری اور گالی گلوج میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ میرزا سوداؔ، میر تقی اور میر حسنؔ کے کلام میں ایسی ہجویات موجود ہیں جنھیں پڑھ کر شرم و حیا کی آنکھیں بند ہوجاتی ہیں اور شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ لوگ جن کے کلام میں اعلیٰ درجہ کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوا ہے کس طرح ایسی پستی تک اتر سکتے تھے، لیکن جب ہم ایسے کلام کو اس ماحول کے پس منظر میں دیکھتے ہیں جو پچھلے اوراق میں پیش کیا جاچکا ہے تو ہمیں اس کا اصلی سبب معلوم ہوجاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے دَور کی ترجمانی کرتے ہیں اور جو گندگی اس سوسائٹی میں راہ پاگئی تھی وہی ان کے کلام کے پردہ سے جھلکتی ہے۔

سوداؔ کی ان ہجویات میں ایک مخمس مولوی ندرت کشمیری کی ہجو میں ہے جس کی ٹیپ کا مصرعہ ہے ؎

ع گھوڑے کو دو نہ دو لگام موتھ کو تنک لگام دو

بظاہر اس ہجو کی محرک مولوی ندرت کشمیری کی ایک غزل ہے جو سوداؔ کو پسند نہیں آئی لیکن مخمس میں کسی بند سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ سوداؔ کو اس غزل میں واقعی کیا چیز ناپسند تھی۔ البتہ ایک دو بند ایسے ہیں جن میں ندرت کے کشمیری محاورہ کا مذاق اُڑایا ہے اور ان کی فارسی دانی پر طنز کیا ہے۔ لیکن سوداؔ نے اس پہ ہی بس نہیں کی، اس کے فوراً بعد ایک اور مخمس ہے جس کا پہلا مصرعہ ہے ؎

ندرت ہے ایک بھڑوا کا ستو ہے ایک مذنا

ایک بند کے بعد اپنی کارگزاری بیان کرتے ہیں :-

شیطاں نے عقل میری کل رات جو گنوائی کشمیری ٹولے سے میں ایک فاحشہ بلائی
زرمفت میں گنوایا، کی آپ پر ہنسائی ڈولی سے وہ جو اُتری یہ نخرے کرتی آئی

اس کے بعد اس رنڈی کے نازونخرے اور اس سے اپنا منھ کالا کرنے کی داستان لکھی ہے۔ مولوی ندرت کی ہجو یہ صرف اس حد تک ہے کہ رنڈی کشمیری ہے اور مولوی ندرت بھی کشمیری۔ لیکن اسے پڑھ کر سوداؔ کے متعلق بہت گھٹیا رائے قائم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ گالی گلوج بھی حد سے گزر گئی ہے اور ساری نظم ایسی ہے جسے آج پڑھنا اور سننا دشوار ہے۔

دو ہجویات ایسی ہیں جو ایک ہی شخص کے لئے ہیں۔ یہ کوئی "شیخ صاحب" ہیں جو باوجود مسن ہونے کے شادی کی حرص میں مبتلا ہیں اور لوگوں کے سمجھانے بجھانے کے باوجود اپنے ارادہ سے باز نہیں رہتے۔ یہ ہجو کے لئے اچھا موضوع ہے اور اسکے محرکات پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے، پھر اس میں ذاتی مخاصمت یا دشمنی کا عنصر

بھی شامل نہیں ہے۔ پہلا بند یہ ہے ۔۔

جوں گھٹا شادی اوٹھی ہو تری گھنگھور ہے　　منہدی دلہن کی ہو سانچق ہو تری اور ہے
رات دن رنگ میں پھرتا ہو سرا بور ہے　　عرش تک بیاہ کا ہو مچا ہے ترا شور ہے
کہتے ہیں حور و ملک شیخ جی اب زور ہے

یہ مخمس مضحک ہے رکیک نہیں لیکن دوسرا مخمس جو اس مصرعہ سے شروع ہوتا ہے

جب میں سُنا کہ بیاہ رچاتے ہیں شیخ جی

اور جس میں شیخ کی عمر نوے سال کی بتائی گئی ہے۔ پھر نہایت فحش اور گندہ ہو گیا ہے خصوصًا وہ بند

ع　تھے لب کہ شیخ بات سے دنیا کی پاک و صاف

رکاکت کی حد اُن ہجویات میں ہو گئی ہے جو سودا نے میر ضاحک کی شان میں لکھی ہیں ایک مخمس ہے

ع　ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا

اس میں رکاکت کی انتہا ہو گئی ہے اور ضاحک سے زیادہ اس کی بیوی کو اس گندگی کا نشانہ بنایا ہے۔ سودا سے ضاحک کی ذاتی چشمک یقینی ہے، لیکن ضاحک کی اہلیہ کا اسمیں کیا دخل ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا ہمیشہ ایسی باتوں پر اُتر آتے تھے کہ ان کا حریف اُن سے ڈر کر نہ ہی اپنی عزت کی خاطر ان کے سامنے سپر ڈالدے اس مخمس کے مقابلہ میں وہ مشہور مخمس بھی کچھ کم نہیں جس کا عنوان ہے۔

ع　یا رب تو مری سُن لے یہ کہنا ہے سکندر

اور جس کی بابت مشہور ہے کہ جب محفل میں پڑھا گیا تو ضاحک اُٹھ کر سکندر کو لپٹ گئے اور بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اگر یہ بات ایک طرفہ ہوتی تو ہم سمجھ لیتے کہ سودا کی افتادِ طبع ہی ایسی تھی اور وہ ہر کس و ناکس سے اُلجھ جاتے تھے اور جب برانگیختہ

ہوتے تو انھیں کچھ نہ سوجھتا، لیکن ضاحک بھی خاموش نہ رہے ہوں گے، وہ بھی ہزل گو تھے جس کا اعتراف خود ان کے بیٹے میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے لیکن انکی ہجویات اب نہیں ملتیں جن سے معلوم ہو سکے کہ انھوں نے سوداؔ کو کیا جواب دیا۔ میر حسن کی قلمی کلیات میں جس کا نسخہ راقم کے پاس ہے۔ ضاحک کی طرف سے میر حسن نے سوداؔ کو جو جواب دیا ہے وہ موجود ہے اور وہ اپنی رکاکت اور ابتذال میں سوداؔ کے کلام سے کچھ زیادہ ہی ہے کم ہرگز نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی گالی گلوچ کوئی غیر معمولی بات نہ رہی تھی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لکھنؤ کی خاص فضا میں ریختی ہجو اور ہزل گوئی کی ابتدا ہوئی وہ اس پس منظر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

لیکن ہجو گوئی پر اتر آنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی اس کے لئے خاص قسم کی طبعی مناسبت درکار ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان کی طبیعت میں شگفتگی ہو دوسرے کسی نہ کسی قدر ہنگامہ پسند ہو۔ اس کے برعکس اگر طبیعت میں مسکینیت اور سکون پسندی ہوگی تو انسان قدرتی طور پر ایسے ماحول سے گریزاں ہوگا اور زندگی گزارنے کے لئے نسبتاً خاموش گوشہ تلاش کرے گا جس دور کا اسوقت جائزہ لیا جا رہا ہے اس میں صوفیوں کی خانقاہوں نے یہ گوشہ مہیا کیا تھا۔ یہ لوگ دنیادار ہونے کے باوجود علائق دنیاوی سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ تصوف کی تاریخ اس کے اصلی مرکز اور فلسفیانہ پہلو سے بحث کرنا اسوقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ یہاں ہمارے پیش نظر وہ تصوف اور وہ صوفی ہیں جن میں افلاطونی، اسلامی، عجمی اور ہندوستانی عناصر شامل ہو گئے تھے اور جن کی آمیزش و آویزش سے زندگی کے بارہ میں ایک خاص انداز فکر کا ظہور ہوا تھا جو چیز ان صوفیوں کو اپنے دیگر معاصرین سے ممتاز کرتی تھی وہ ان کی گوشہ نشینی اور عزلت پسندی تھی جس قسم کے ہنگامے، سیاسی سازشیں اور خود غرضیاں درباروں و محفلوں

میں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ لوگ اُن سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت خود میں نہیں پاتے تھے۔ اس لئے اس صَف سے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ دنیا اور اس کے ہنگاموں کے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا کہ یہ سب چیزیں عارضی اور ہنگامی ہیں۔ اصلی زندگی روحانی زندگی ہے جس کے حصول کے لئے تزکیۂ نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تزکیۂ نفس کے لئے بار بار کوشش ظاہر کرتی ہے کہ اخلاقی اعتبار سے سوسائٹی پستی کی ایسی حد تک پہنچ گئی تھی کہ اسکی اصلاح کے لئے ایک زبردست اور منظم تحریک کی ضرورت تھی۔ ایشیائی ملکوں میں خاص طور پر مذہب کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا تقاضہ تھا کہ اس اصلاحی تحریک کا دار و مدار مذہب پر ہو۔ چنانچہ تصوّف کی اساس کو مذہب پر ہی قائم سمجھا گیا ہے اور صوفی بزرگ اپنے تمام سلسلے پیغمبر اسلام پر ہی ختم کرتے ہیں۔ مذہب کے دو پہلو قابلِ توجہ تھے۔ ایک عبادات اور دوسرے اخلاق۔ عبادات کا تعلق بڑی حد تک افراد سے ہے اور اس میں عبد و معبود کے علاوہ تیسرے کا دخل نہیں۔ لیکن اخلاق و اعمال کا احاطہ وسیع ہے اور پوری سوسائٹی پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ صوفیوں نے تزکیہ نفس میں اخلاق و اعمال پر ہی سب سے زیادہ زور دیا گویا اس پستی کے خلاف جس کا ذکر کیا جا چکا ہے تصوّف ایک ردِ عمل کے طور پر مقبول ہوا۔

جس طرح ہجو گو شعراء اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں صوفی شعرا کا کلام اس ردِ عمل کو ظاہر کرتا ہے اصنافِ سخن میں تصوّف کا سلسلہ دُور تک پہنچتا ہے اور اُردو میں فارسی غزل کے اثرات کے ساتھ اس کا راہ پانا قرین قیاس ہے۔ اس لئے یہاں بھی شروع سے ہی تصوّف کے عناصر غزل کا جزو بنکر نظر آتے ہیں۔ دکن کے ابتدائی دَور سے وَلی تک ان مضامین کی جھلکیاں ملتی ہیں جو پھر میرزا مظہر جانجاناں، سراج الدین علی خاں آرزو، میر اور میر درد کے یہاں پوری طرح روشن ہو گئی ہیں اور ان سب کے کلام کے صحت مند اثرات نے اردو شاعری کے دامن سے

تجربات کے دھبے دھونے کی کوشش کی ہے۔ ان مضامین پر بعض لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے کہ زندگی کی جدو جہد سے مردانہ وار عہدہ برآ ہونے کی بجائے یہ انسان کو فرار کی راہ دکھاتے ہیں۔ لیکن فرار، درصل اس ماحول میں اصلاح کی طرف پہلا قدم ہے۔ صوفی انسان کو جس زندگی کی تلقین کرتا ہے وہ نیکی اور پاکیزگی کی زندگی ہے۔ ایسے مضامین مختلف شعرا کے کلام میں موجود ہیں اور ان کی نمائندگی سب سے بہتر درد کرتے ہیں۔ جن کا انداز یہ ہے :-

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بُت خانہ تھا　　ہم سبھی مہمان تھے واں اک تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا
حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراج خزاں　　آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا

شرار و برق کی سی بھی نہیں یاں فرصت ہستی　　فلک نے ہم کو سونپا کام جو کچھ تھا شتابی کا
میں اپنا درد دل چاہا کہوں جس پاس عالم میں　　بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا

مثل شرر تنگ چشم ہستی بے بود ہے　　دیکھ نہ سکنا اوسے ٹک بھی جدھر دیکھنا

اکسیر پہ مہوس اتنا نہ ناز کرنا　　بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا
تو اپنے ہاتھوں آپ ہی پڑتا ہے تفرقہ میں　　اے امتیاز ناداں ٹک امتیاز کرنا

مثل نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا　　ہم رو سیاہ جاتے رہے نام رہ گیا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا　　کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

یہ روایت اس حوالہ کے بغیر آبِ حیات میں بھی ملتی ہے اور ممکن ہے بعض حضرات آبِ حیات کی چند اور روایات کی طرح اسے بھی محض آزاد کی اختراع سمجھیں لیکن میر اور جرأت دونوں کی وفات سنہ ۱۲۲۵ھ میں ہوتی ہے۔ مجموعہ نغز ان دونوں کی زندگی میں لکھا گیا اور اس کا مصنّف ایک ایسا شخص ہے جس کا ذاتی تعلق اور مراسم اپنے ہم عصر شعراء سے بہت گہرے تھے، ایسا نہ بھی ہوتا تو معاصرین کے بارہ میں روایات یا واقعہ نقل کرنے سے ہی اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصّہ کسی نہ کسی حد تک عوام میں پھیل چکا تھا۔ اگر میر نے واقعی جرأت کے بارہ میں یہ کچھ کہا ہو تو کوئی تعجّب کی بات نہیں کیوں کہ ان کا اپنا اندازِ سخن جرأت سے کسی قدر مختلف ہے۔ وہ ایک صوفی باپ کے صوفی بیٹے تھے اور حقیقت و معرفت کے مضامین ان کے کلام میں جابجا شعلوں کی طرح دمکتے نظر آتے ہیں عشقِ مجازی کے بیان میں انھوں نے "واقعات" سے زیادہ "کیفیات" پر توجّہ صرف کی ہے۔ جرأت کے یہاں معاملہ برعکس ہے۔ نہ ان کے یہاں عارفانہ مضامین ہیں اور نہ خصوصیت کے ساتھ صرف "کیفیات"۔ اس جگہ ان کے کلام میں واردات اور واقعات نے لے لی ہے جنھیں "معاملات" کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور چوما چاٹا سے غالباً میر کی مُراد انھیں مضامین سے ہے۔

اس کے بعد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے بیان کو دیکھئے انھوں نے اپنا تذکرہ گلشنِ بےخار سنہ ۱۲۴۸ھ میں شروع کرکے سنہ ۱۲۵۰ھ میں مکمل کیا۔ اسمیں جرأت کے بارہ میں لکھتے ہیں :-

"سخن بہ مضامینے کہ میان عاشق و معشوق می گذرد می کرد طبعِ رسا داشت و حسرت از شاگردیش نا رسا۔ دیوان ضخیمے مشحون بانواعِ سخن ترتیب دادہ چوں از اصول و قوانین این فن بہرہ نداشتہ نغمہائے خارج از آہنگ می سرودہ و آوازہ اش کہ

چوں طبل دکو تر رفتہ از انست کہ پذیرائی خاطر وگوارائی طبع او باش و الواط حرف مینردہ و معہذا بعض ابیاتش بغایت خوش ادا و دلربا آمدہ ؟ ہر انچہ از دیوانش بطریقہ اہل فن بود انتخاب دریں اوراق ثبت افتاد" [۱]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جرأت کی وفات کے بعد ربع صدی گزر جانے پر بھی ان کی شاعری کے متعلق دو باتیں عام طور پر مسلم تھیں۔ ایک تو یہ ان کے یہاں بقول میر چوما چاٹی یعنی مضامین میں بوس و کنار یا بقول شیفتہ اوباشوں اور آوارہ گردوں کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کے کلام کا صرف ایک حصہ "بطریقہ اہل فن" تھا جس کا انتخاب شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں شامل کیا ہے۔ گلشن بیخار میں جرآت سے قطع نظر دوسرے شعرا کے بارے میں شیفتہ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تنقید بری طرح ان دو چکروں میں پھنس گئی تھی۔ وہ ایک زوال آمادہ جاگیردارانہ نظام کے ایک جزو تھے، پھر وہ ایک نواب اور عالم بھی تھے اسی لئے انھیں بڑے رکھ رکھاؤ کی ضرورت پڑتی تھی۔ رکھ رکھاؤ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مثال ایک متین و متدین بلند و بالا شخصیت کی سی سمجھتے تھے جس کے سایہ میں غالب، مومن اور حالی سب کو پناہ ملتی ہے اور جسے خوش کرنا ہی غالب اپنی فارسی شاعری کا مقصد قرار دیتے ہیں اور جس کے انیس کے ایک مصرع کے پڑھنے پر حالی سر دھنتے نظر آتے ہیں۔ ان کا دربار ایسی بلند بارگاہ ہے جہاں یہ سب لوگ با ادب با ملاحظہ ہوشیار نظر آتے ہیں۔ ایسا دربار جہاں عوام کو شرف باریابی نصیب نہیں ہوتا، انھیں اوباش و الواط سمجھا جاتا ہے اور ان کا کلام پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

---

[۱] گلشن بیخار صفحہ ۷۳

دوسرا جکّر طریقہ اہل فن یا طرقِ راسخہ تھا جس کا مطلب ایک شدید قسم کی روایت پرستی کے علاوہ اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ دیکھئے انھیں چکروں میں پھنسکر یہ ناقد نظیر اکبرآبادی کے بارے میں بھی بالکل اسی قسم کی رائے دیتا ہے:-

"اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیان جاریست و نظر باں ابیات در اعداد شعرا نشاید ش شمرد، اما برعایت ابیات منتخب قطع نظر کردہ شد" [1]

انشا، اللہ خاں انشا بھی اس زد سے نہ بچ سکے۔ انکے بارہ میں لکھتے ہیں:-

"دیوانے دارد مشتمل بر اصناف سخن و ہیچ صنف را بطریقہ راسخہ شعرا نہ گفتہ" [2]

ستم اس پر یہ ہے کہ انشا کے کلام کا جو انتخاب شیفتہ نے شامل کیا ہے اسمیں لکھتے ہیں کہ یہ پہلا شعر راقم کو نہایت پسند ہے:-

اوس سے خلوت کی جٹھہر جاتی تو میں اللہ سے واسطے دو دن کے عرش کبریائی مانگتا

غرض جرأت کی شاعری کے بارے میں یہ دو باتیں اس درجہ عام ہوئیں کہ جرأت کی شاعری اور معاملہ بندی کچھ مترادف سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ موجودہ دور کے ایک ناقد مومن اور جرأت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ معاملہ بندی ان دونوں نے اختیار کی ہے لیکن جرأت بوجہ اپنی کم علمی کے بہت کھل گئے ہیں [3]، اور مومن کی علمیت نے ان کی پردہ پوشی کر لی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو مومن اور ان کے ناقد دونوں رسم وراہ عام کی پابندی سے آزاد نہ ہو سکے۔ جرأت کی شاعری کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ان معاملات کو موضوع بنایا جن کے وجود سے انکار کوئی نہیں کرتا لیکن شجر ممنوعہ کی طرح انھیں ہاتھ لگاتے سب ڈرتے تھے اور پھر ان کے اظہار کے لئے جو طریقہ اختیار کیا وہ طریقہ اہل فن یا طرقِ راسخہ شعرا

---

[1] گلشن بیخار صفحہ ۲۳۱ [2] ایضاً ۲۹ [3] دیوان مومن، ضیاء احمد

یا بالفاظ دیگر رسمی ڈگر سے ہٹا ہوا ہے اور یہ بھی جرأت کی عظمت کی دلیلوں میں سے ایک ہے۔

جرأت کی شاعری کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے بعض ایسے حالات و واقعات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جنھوں نے اس کی زندگی اور خاص طور پر اس کی نفسیاتی کیفیات کو متاثر کیا ہوگا جیسا کہ معلوم ہے کہ جرأت کے والد حافظ امان سنہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہی حملہ میں مارے گئے اور اس طرح وہ بچپن میں ہی مہر پدری سے محروم ہو گئے جو بچپن میں ایک پرسکون زندگی کی ضمانت ہوتی ہے۔ یہ ایک ذاتی حادثہ تھا جس نے معلوم نہیں آگے چلکر جرأت کو کس کس نفسیاتی الجھاؤ میں گرفتار کیا ہوگا۔ کیوں کہ ہماری سوسائٹی میں یتیم کی حالت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اس میں ایک قسم کا احساس کمتری یا احساس کہتری پیدا ہو جاتا ہے اور اس کو چھپانے کے لئے انسان اکثر غیر معمولی حرکتیں کرنے لگتا ہے جن میں انانیت کا حد سے بڑھ کر ظاہر ہونا ایک صورت ہے اور فرار یا پسپائی دوسری صورت۔ اس کے بعد ذاتی حادثہ سے قطع نظر نادری حملہ ایک سماجی طوفان تھا جس نے سوسائٹی کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ جو لوگ قتل عام میں مارے گئے وہ الگ رہے۔ قیام امن پر لوگوں میں ایسی بھگدڑ مچی کہ روزانہ قافلے کے قافلے دلّی سے باہر نکلنے لگے اور شاہجہاں کی پیاری دلّی ویران ہو گئی۔ یہ کوئی کم حادثہ نہ تھا کہ خان آرزو، میر، سودا، میر ضاحک میر حسن، انشا، مصحفی اور جرأت میں سے ایک بھی دلّی میں نہ ٹھہر سکا۔ میر درد البتہ رہ گئے لیکن وہ صوفی تھے اور اپنی مسند رشد و ہدایت کو چھوڑ نہ سکتے تھے۔

ہجرت یا ترک وطن یوں بظاہر کوئی بڑا حادثہ معلوم نہیں ہوتا خاصکر جب یہ پُرسکون اور بتدریج ہوا ہو۔ لیکن جو لوگ دلّی سے فیض آباد اور لکھنؤ آئے

اُن کے لئے یہ ایک بڑا تہذیبی سانحہ تھا۔ ان میں ہر شخص بار بار دلّی کو یاد کرکے روتا ہے۔ ان کے دل بیقرار اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ دلّی مرحوم کا تذکرہ ان کے زخمی دل کے ساز کو چھیڑ دیتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ بظاہر دلّی کے مقابلہ میں یہاں فضا پُرسکون تھی۔ ایک نئی سلطنت قائم ہوئی تھی جو شاہانہ اولوا العزمی میں مغلیہ سلاطین پر بازی لے جانا چاہتی تھی۔ علم و فن کی قدر دانی تھی۔ شاعروں کی سرپرستی ہوتی تھی اور انھیں سب چیزوں کی تلاش میں ارباب فضل و کمال دلّی سے نکلتے تھے لیکن اس چشمہ آب حیواں پر پہنچ کر بھی وہ مایوس اور ناکام نظر آتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب کبھی بڑے پیمانہ پر ہجرت کا واقعہ پیش آتا ہے تو ایک تہذیبی اور ثقافتی تصادم ہوتا ہے۔ دو مختلف روایات کی حامل جماعتیں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے دلّی والے اپنی روایات لائے ہوں گے جو صدیوں سے انکی رگ و پے میں سما چکی ہوں گی۔ لکھنؤ والوں کی نئی روایات قائم ہو رہی تھیں، ان دونوں میں ایک مفاہمت یا سمجھوتے کے لئے کچھ مدّت درکار تھی، دلّی والے اپنی روایات سے وابستہ رہنا چاہتے ہونگے وضع قطع، لباس، تراش خراش اور گفتگو میں وہ لکھنؤ والوں کے سامنے آسانی سے سپر ڈالنے کے لئے تیار نہ ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ میر انیس اور ان کے خاندان والوں میں بار بار اس جذبہ کا اظہار رہا ہے۔ دوسری طرف نئے عناصر ان سب کو اپنی طرف کھینچ رہے ہوں گے۔ یہ کشاکش اور تصادم بھی نفسیاتی الجھاؤ پیدا کرتے ہیں۔ کبھی تو ایسے موقعہ پر انسان اپنی قدیم روایات سے اور زیادہ سختی سے وابستہ نظر آتا ہے اور کبھی وہ سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس سمجھوتے میں اکثر یہ صورت بھی دیکھی گئی ہے کہ لوگ اپنی حدا ورمنا سب تقاضوں سے تجاوز کرکے نئی روایات کے اختیار کرنے میں خود نئی روایات قائم

کہنے والوں سے دو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں لکھنؤ کی خاص روایات کا اثر خالص لکھنوی شعرا سے بہت پہلے بہت صاف اور شدید جن لوگوں میں نظر آتا ہے وہ سب دلّی سے آنے والوں میں ہیں جنمیں انشا، جرأت اور رنگین پیش پیش نظر آتے ہیں۔

جرأت کا بینائی سے محروم ہوجانا انکی زندگی کا ایک اور اہم حادثہ ہے خصوصاً جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ یہ عین جوانی میں پیش آیا، جو شخص مادر زاد اندھا ہو، جسنے روشنی اور تاریکی کے فرق کو نہ جانا ہو، جو جسم کے خدّ و خال اُتار چڑھاؤ اور اُبھار نہ دیکھ چکا ہو، جسے رنگوں کے لطیف تاثرات کا حس ہی نہ ہوا ہو، اُس کے لیئے اس ایک حس کا نہ ہونا اس قدر اذیت دہ نہیں ہو جس قدر ایسے شخص کے لیئے جو رنگینیوں اور رعنائیوں سے دامنِ نگاہ بھر چکا ہو اور پھر جس کے لیئے روشنی یکایک ایک محیط اندھیرے سے بدل جائے، جرأت کے ساتھ بھی یہی پیش آیا۔ نفسیاتی اعتبار سے اس نے جو اثر ڈالا ہوگا وہ جرأت کی شاعری کے مطالعہ کے لیئے خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ اس قسم کی محرومی کا نتیجہ سب سے پہلے ایک قسم کے احساس کہتری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کی معذوری خاص کر بصارت کے معاملہ میں اسے ہم چشموں کی نظر میں کچھ نہ کچھ حقیر کر دیتی ہے اور پھر وہ اپنے میں ایک قسم کی ذاتی خامی یا کمی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیئے وہ ایک قسم کا مصنوعی احساس برتری پیدا کرنا چاہتا ہے جسے ہم خود فریبی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ خود فریب میں مبتلا طور پر ہے اور دوسروں کو بھی فریب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ عام طور پر یہ احساس انکی شخصیت یا فن کے کسی ایسے پہلو سے وابستہ ہوتا ہے جو اس کے آب حیاروں سے ممتاز و مفتخر کرنے کی دلیل بن سکے۔ حسب و نسب پر فخر

ہو یا خاندانی روایات پر، اپنے علم وفضل کا اظہار ہو یا شاطرانہ کمال کا دعوٰے سب اسی احساس کی غمازی کرتے ہیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے انسان کو ایسا سہارا قائم کرنے کے لئے بھی کوئی بنیاد نہیں ملتی تو وہ خود ایک سہارا پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے افکار و اعمال کو ایسے راستوں پر ڈال دیتا ہے جو اجنبی ہوتے ہیں اور اسے یہ تسکین حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے میدان میں اکیلا ہی ہے چاہے وہ میدان سنگلاخ اور بنجر ہی کیوں نہ ہو۔

اس احساس کا پیدا ہونا اور اس کا ان مختلف راستوں سے اظہار صرف بینائی سے محرومی تک محدود نہیں، محرومی کہیں ہو اور کسی قسم کی ہو نتیجہ قریب قریب ایک سا ہی نکلتا ہے۔ میر، مصحفی اور غالب کے نفسیاتی مطالعے سے بھی یہی نتائج نکلتے ہیں۔ جرأت کے یہاں البتہ اور چیزوں کے علاوہ ان کی بے بصری ایسی محرومی تھی جسنے انھیں سوسائٹی کی رنگین محفلوں سے خارج کرنا چاہا، اس کی تلافی انھوں نے ایسا رنگ اختیار کرنے سے کر لی جو بقول بعض عامیانہ اور بازاری ہونے کے باوجود لوگوں کے دلوں کو کھینچنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ جرأت لکھنؤ کی رنگین محفلوں میں کب داخل ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ سنہ ۱۲۲۵ میں تو ان کا انتقال ہی ہو گیا۔ مصحفی جو سنہ ۸-۷-۱۲۰۷ھ (۱۷۹۳ء) میں خود سلیمان شکوہ کی ملازمت میں داخل ہوئے، اُن کے بیان میں لکھتے ہیں:۔

" ہمچنیں قلندر بخش جرأت کہ پس از فقیر بعد سہ چہار ماہ ملازمت حضور حاصل نمودہ بہ نوازش خسروانہ در آمدہ و نیز نوکرت قائم

اس طرح سے یہ واقعہ سنہ ۱۲۰۷ھ سے پہلے کا ہو سکتا ہے۔ سلیمان شکوہ کی ملازمت سے پہلے جرأت نواب محبت اللہ خاں ابن حافظ رحمت خاں رہیلہ کے دربار سے متوسل تھے جو لکھنؤ چلے آئے تھے اور نواب آصف الدولہ انھیں وظیفہ دیتے تھے اسپرنگر (فہرست کتب خانہ شاہان اودھ صفحہ ۲۵۱) کے بقول وہ سنہ ۱۱۹۶ میں لکھنؤ میں موجود تھے اور ان کی وفات جرأت کی وفات سے ۳ سال پہلے سنہ ۱۲۲۲ھ میں ہوئی۔ اس حساب سے جرأت انکے یہاں سنہ ۱۱۹۶ھ اور ۱۲۰۷ھ کے درمیان ملازم ہوئے ہوں گے لیکن ان تاریخوں سے بھی جرأت کے لکھنؤ پہنچنے کی قطعی تاریخ کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ فیض آباد کی جگہ لکھنؤ دارالخلافہ بن چکا تھا اور نواب آصف الدولہ بہو بیگم کی نظروں سے دور رہ کر آزادی اور عیش کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، سعادت خاں برہان الملک اور ان کے جانشینوں کی جدوجہد سے سلطنت کو کسی قدر استحکام حاصل ہو چکا تھا اور دہلی کے مقابلہ میں امن و امان کی صورت زیادہ نظر آتی تھی۔ چنانچہ اس طمینان اور فارغ البالی کا اثر پہلے پہل مشاعروں، جلسوں اور جلوسوں کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر اسکی لے یہاں تک بڑھی کہ قیصر باغ کے مشہور میلہ سے جا ملی جہاں کرشن کنہیا اور گوپیوں کا رومانی ڈرامہ کھیلا جاتا تھا واجد علی شاہ خود کنہیا بنتے اور محلات گوپیوں کا روپ دھارتیں۔ عام ماحول سے جرأت کا متاثر ہونا لازمی تھا ذاتی طور پر انھیں اور بھی اپنا غم غلط کرنے کے لئے کوئی ذریعہ تلاش کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے گانے بجانے اور حسینوں کی صحبت میں اپنے لئے سکون تلاش کیا۔ آب حیات میں اندھے ہونے سے پہلے کی ایک روایت ہے کہ آشوب چشم

۲۹۹۱۰۳

میں مبتلا ہوئے اور بہانہ کیا کہ اندھے ہوگئے ہیں۔ اس بہانہ سے بے پردہ گھروں میں آنے جانے لگے اور تاک جھانک کے پورے مزے اٹھائے، آخر کو راز کھلا اور یہ وہاں سے نکالے گئے۔ ممکن ہے یہ واقعہ غلط ہو لیکن جرأت کی طبیعت یقیناً کچھ اسی قسم کی تھی، ان کے قریبی زمانہ کے لوگوں نے لکھا ہے کہ موسیقی کا خاص شوق تھا اور ستار نوازی میں تو ماہر تھے ظاہر ہے کہ یہ زندگی (اسی) کے لئے ہے جس کی طبیعت میں رنگینی اور امنگ ہو۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ نے صاف صاف لکھا ہے کہ وہ اپنا وقت حسینوں کی صحبت میں گزارتے تھے، ظاہر ہے وہ یہاں ان کی دید کی لذت سے محروم ہوں گے اس لئے لذت حاصل کرنے کے لئے انکے پاس یا تو سماعت تھی یا لمس، سماعت سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے لمس کا حال یہ ہے کہ ان کے جو اشعار "معاملاتِ میانِ عاشق و معشوق" کے ہیں، اور جسے غلط نام دے کر معاملہ بندی کہا گیا ہے ان میں اس قسم کی لذت پائی جاتی ہے جسے لمسیاتی یا حسیاتی (SENSUOUS) کہہ سکتے ہیں۔ اس لذت کے حصول کا ذریعہ لمس اور اثر وہ کیفیات ہیں جنکا تعلق لمس اور اتصال سے ہے۔

جرأت جس زمانہ میں مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے متعلق ہوئے انھیں انشا، مصحفی اور دوسرے شعرا کے ساتھ مقابلوں اور معرکوں میں شریک ہونا پڑا ہوگا، ان میں انشا، اور مصحفی کا معرکہ خاص طور پر یادگار ہے کیونکہ اس سے پہلے اردو شاعری کی تاریخ میں اس قسم کی صرف ایک مثال اور ملتی ہے اور یہ انشا اور نظیم کا معرکہ ہے جو نواب مرزا مینڈھو سربسر کے مشاعرہ میں دلّی میں پیش آیا۔ مصحفی اور انشا کا معرکہ شاعرانہ چوٹوں سے گزر کر ہجو تک اور بالآخر فوجداری تک پہنچا اور فریقین نے جیسی کچھ کیچڑ اچھالی اس کی تفصیل اب ہر جگہ ملتی ہے، جرأت کا سارا کلام پڑھنے کے بعد بھی یہ شبہ نہیں ہوتا کہ انھوں نے اس معرکہ میں کوئی نمایاں

حصہ لیا یا کسی ایک فریق کا ساتھ دیا۔ انشا اور مصحفی نے بھی اپنے اشعار میں انھیں اس مناقشہ میں الجھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ دوسرے وہ درباری اثرات جو مصحفی کے یہاں کم تر اور انشا کے یہاں بیشتر راہ پا گئے ہیں جرأت کا کلام ان سے بھی محفوظ ہے چنانچہ انشا اور مصحفی کے یہاں قصیدہ اور ہجویات بکثرت ہیں انشا کے یہاں تو شوخی ریختی کے رنگ میں بیحد کھل گئی ہے جرأت کا دیوان ان عناصر سے پاک ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت خالص شاعرانہ قسم کی تھی اور وہ ان سازشوں اور معرکوں سے بھاگتے تھے جہاں شاعروں اور شاعری دونوں کی پگڑی اچھالی جاتی تھی، میر حسن ان کا ذکر کرتے ہوئے اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ فن شعر کے دیوانہ تھے۔ ظاہر ہے فن سے جس شخص کا لگاؤ شوق کی حد سے گزر کر دیوانگی تک پہنچ جائے وہ ان جھمیلوں سے کیا سروکار رکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے حقیقی جوہر جرأت کے کلام میں بیحد نمایاں ہیں۔

اس پس منظر میں جرأت کے کلام کا جائزہ لینا چاہیے۔ پہلے وہ مضامین دیکھیے جو بقول ناقدین بوس و کنار اور چوما چاٹی سے متعلق ہیں:-

کہہ کے چپکے سے کچھ اس سے جو شب وصل میں ہاں　　باندھ کر ہاتھ کو پاؤں پہ گرا جاتا ہوں
تو وہ کہتا ہے کہ بس مجھ سے یہ باتیں نہ رہیں　　ورنہ میں گھر کو ابھی اپنے چلا جاتا ہوں

دیکے بوسہ مجھے چتون میں جتاتا ہے وہ شوخ　　ایسا پایا ہے بھلا تو نے مزہ اور کہیں

یاد کیا آتا ہے وہ میرا لگے جانا اور آہ　　پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آجائیگا

باتیں کرتے کرتے پیارے دل دھڑکنے کیوں لگا　　سُن کے کچھ آہٹ کہو کیا دل میں کھٹکا ہوگیا

مرے گھر میں جو وہ آیا تو پھر گھبرا کے یُوں بولا　　　یہ جاتا تھا کہاں میں اور ہوا میرا کدھر آنا

حرفِ مطلب کو مرے سنکے بصد ناز کہا　　　ہم سمجھتے نہیں بکتا ہے تو سوڑائی کیا

ہاتھ پاؤں کو لگانے وصل میں دیتے نہیں　　　آپ کے ہاتھ یہ اچھا ستانا لگ گیا
کیا کہوں اسکی ادائیں وصل کی شب کو کہ بس　　　ہاتھ لگ جاتے ہی بس کیا کسمسانا لگ گیا

آج گھیرا ہی تھا اسے میں نے　　　کرکے اقرار مجھ سے چھُوٹ گیا

اس ڈھب سے کیا کیجے مُلاقات کہیں اور　　　دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور

اک آہ سرد کھینچ کے رہ جاتے ہیں ہم آہ　　　دل کو مسوس سینہ پہ ہاتھ اپنے مار کر
کہنا کسی کا یاد جب آتا ہے یہ ہمیں　　　اتنا نہ بھینچ بھینچ کے تو مجھ کو پیار کر

جی کی جی میں مری رہ جائیگی بات　　　گر شبِ وصل میں شرمائے گا

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہُوا　　　چنپئی رنگ اور بدن اس کا وہ گدرایا ہوا

شب جو کچھ اور رہ کہا تو کس ادا سے بولا　　　میرے اور تیرے کچھ اس بات کا اقرار نہ تھا

لذتِ وصل کوئی پوچھے تو پی جاتا ہُوں　　　کہہ کے ہونٹوں میں ہونٹوں کے ملانیکا مزا

شب گھر جو رہا مرے وہ مہماں — تھا صبح یہ کس ادا سے کہتا
طاقت نہ رہی بدن میں ہے ہے — قربان گیا یہاں کا رہنا

شب کیا یہ چپکے چپکے وہ شوخ و شنگ بولا — دیکھو نہ بولیں گے ہم گر پھر پلنگ بولا
جل بیٹھے تھے ہم اور وہ چوری چھپے تو جرأت — بس کیا کہیں وہ دھڑکے جو ہیں پلنگ تلے لا

یہ کیوں کہتے ہو گھر والے مجھے آنے نہیں دیتے — دوانہ ہوں غرض میں یوں تمہارے ہاں بہانے کا
وہی تم ہو وہی گھر ہے وہی ہیں لوگ کیوں پیارے — جب آتے کس طرح تھے اب نہیں ہے ڈھب کیونکر آنیکا
لگایا دل کسی سے تم نے شاید کیوں مکرتے ہو — سبب ہرگز نہیں ہے اور میرے گھر نہ آنیکا

ہاتھ پاؤں پہ میں رکھا تو کہا — کچھ بہت کرنے تم سہاگ لگے

وصل کی شب کچھ تو نکلے آرزوئے دل بھلا — اسقدر ٹھیری نہ ہم سے ہٹ کی ہٹ کر سو رہیے
یاد آتا ہے یہ جب کہنا تو اڑ جاتی ہے نیند — اپنی ہٹ تو رکھو چکے لو اب تو ہٹ کے سو رہیے

لگ چلا میں جو شب وصل تو ہٹ کے یہ کہا — جھانکتا روزن در سے نہ ہو ہے ہے کوئی

اشعار کا یہ انتخاب جرأت کے اس خاص رنگ کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے جسے ناقدین نے چوما چاٹا، مضامین بوس و کنار اور اسی قسم کے

دوسرے ناموں سے تعبیر کیا ہے اور جسے ہم چاہیں تو نئی اصطلاح میں "فاحشانہ" کہہ سکتے ہیں۔ ان کے متعلق پہلے یہ اعتراف کرلینا چاہیئے کہ اخلاقی اور حکیمانہ نقطۂ نظر سے یہ اشعار ادنیٰ درجہ کے ہیں، لیکن جرأت نے کہیں ایسے مضامین اداکرنے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہم اسے بہ حیثیت معلّم اخلاق پرکھ رہے ہیں جرأت کے یہ مضامین فاحشانہ اور عاشقانہ سہی ان میں پہلی بات یہ ہے کہ ان کے ذاتی واقعات اور واردات معلوم ہوتے ہیں۔ خارجی شہادتیں آپ کے سامنے آچکیں، ان سے یہ معلوم ہو گیا کہ جرأت کی زندگی راگ و رنگ اور حسینوں مہ جبینوں کی صحبت میں گزری تھی، اس روش کی تحریک خواہ غم غلط کرنے کی تلاش سے ہوئی ہو یا اظہار برتری کے لئے یا اس میں اس عہد کی لکھنؤ کی عام رنگین فضا کی جھلک ہو، یہ کلام ان خارجی شہادتوں کی توثیق کرتا ہے۔ جرأت پر یہ الزام لگانے سے پہلے کہ وہ فحش گو تھے کم از کم اتنا تو اعتراف کرنا ہی پڑیگا کہ ان معنوں میں انھوں نے غزل کو رسمی عشق و عاشقی کے مفروضہ مضامین اور فرسودہ موضوعات سے آزاد اور بلند کر کے حقیقی معاملات اور واقعات کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا، وہ ایک دنیا دار آدمی تھے اور انھیں حضرت آدم کی اولاد جنھیں اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے حوّا کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ جذباتِ انسانی کی گہما گہمی یا بوقلمونی بنیادی طور پر انھیں جذبات اور احساسات سے وابستہ ہے جنھیں ہم جنسی کہتے ہیں شعر و ادب اور تمام دیگر فنونِ لطیفہ کی ارتقا میں اس جذبہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہاں اس جذبہ کی تفصیلات اور اس کے مختلف مدارج و مناظر کے فرائڈ ی نقطۂ نظر کی تشریح کی ضرورت نہیں، اتنا جان لینا کافی ہے کہ جرأت کے ان اشعار میں اسی قسم کی جنسی سیرابی اور کہیں جنسی بھوک ملتی ہے جیسی عام انسانوں کی

زندگی میں پائی جاتی ہے۔ ان جذبات کا اظہار روایتی اخلاق کے معیار سے مذموم سہی۔ جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ایک صحت مند علامت ہے کیونکہ جہاں ان جذبات کو دبایا جاتا ہے وہاں یہ تحت شعور میں پہنچکر اظہار کے دوسرے مواقع اور ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ یہ ذرائع شاید روائتی اخلاق کے نقطۂ نظر سے شرم وحیا کے معیار پر کامل ٹھیریں، لیکن عملاً ان کی نتائج شدید قسم کی ذہنی اور جسمانی بیماریوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن غزل گو شعراء نے صحت مند جنسی جذبات کو دبانے کی کوشش کی ہے وہ ایسے نفسیاتی الجھاؤ میں گرفتار ہوئے ہیں جو امرد پرستی

کی شکل میں ظاہر ہوا ہے اور اسی وجہ سے ان کے کلام میں امرد پرستی کے مضامین بار بار آتے ہیں۔ شاعری بالخصوص غزل میں، ان مضامین کے داخل ہونے کی طرح طرح سے توجیہات کی گئی ہیں۔ کہیں تصوف کی آڑ پکڑی گئی ہے اور کہیں ایرانی تہذیب ومعاشرت اور ترکانہ حسن کی شہرت پر اس کا دارومدار بتایا گیا ہے، لیکن اصلی سبب یہی نفسیاتی الجھاؤ ہے۔ غور سے تجزیہ کیا جائے تو یہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ جو لوگ اپنی خانگی ازدواجی زندگی میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ ان کے یہاں ایسے مضامین نسبتاً کثرت سے ہیں۔ مثال میں ایک میر تقی میر کو لے لیجیے جو اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں جس پر وہ مرتے ہیں، دو ہی صورتیں ممکن ہیں ایک تو یہ کہ میر در اصل کسی عطار کے لونڈے پر عاشق ہوں اور یہ بھی اسی وقت پیش آسکتا ہے جب انھیں جنسی آسودگی کے لئے فطری ذریعہ حاصل کرنے میں مایوسی ہوئی ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتے ہوں، کسی عورت پر عاشق ہوں اور لوگوں کے ڈر یا اپنی کم زوری سے عطار کے لونڈے کا نام لیتے ہوں، یہ صورت بھی جنسی تسکین سے ان کی محرومی کی طرف

غمازی کرتی ہے۔ کیوں کہ اس طرح وہ اپنے خیال اور قول سے تسکین کے لئے ایسے مواقع اور محل تلاش کر رہے ہیں جن کے علاوہ اور صورتیں ان کی دسترس سے باہر تھیں

جرأت کے یہاں امرد پرستی کے مضامین تقریباً ناپید ہیں۔ پوری کلیات میں ایک دو اشعار جو کہیں موجود ہیں وہ خالص رسمی اور بعض اوقات محض کبھی رعایت لفظی سے پیدا ہوئے ہیں، غالباً جرأت کے کلام کا یہ صحت مندانہ پہلو ہی انھیں معاصرین میں ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس اعتبار سے متقدمین میں ایک شاعر اور ہے جو جرأت سے قریب تر آجاتا ہے، یہ حکیم مومن خاں مومن ہیں جنھوں نے بقول ضیاء احمد ایک پردہ نشین کو اپنا محبوب بنایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پردہ نشین کا لفظ بار بار مومن کے یہاں آتا ہے اور جرأت کے یہاں یہ اس کثرت سے نہیں، لیکن دیوان کے مطالعہ کے بعد اس میں شبہ کی گنجایش نہیں رہتی کہ جرأت کی محبوبہ ان کی سوسائٹی کی ایک عورت ہو اور یہ عورت بازاری یا طوائف نہیں ورنہ اس کے ملنے کے سلسلے میں بار بار روک ٹوک کا ذکر نہ ہوتا اور نہ دونوں کو چھپ کر ایک دوسرے سے ملنے کی ضرورت پیش آتی، اس صورت میں اس کے در تک رسائی میں وہ دشواریاں بھی حائل نہیں ہوتیں جن کا ذکر جرأت نے بار بار کیا ہے، ان کے رقیب بھی بہت سے نہیں ہیں اور اسی لئے رشک اور رقابت کے مضامین بھی ان کے یہاں کم ہیں۔ اُن کی محبوبہ ان سے چوری چھپے آکر ملتی ہے۔ دونوں کو ڈر رہتا ہے کوئی دیکھ نہ لے، ملاقات کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جرأت کو جنسی آسودگی حاصل ہوگئی اور وہ اس مزہ کو بڑا کیف لیکر بیان کرتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ملاقات کا سلسلہ یکایک ختم ہوجاتا ہے جسکا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبوبہ نے رُسوائی کے خوف یا عزیزوں کی روک ٹوک سے ملنا چھوڑ دیا یا اسے کوئی اور چاہنے والا مل گیا۔ بعض اشعار اس کی طرف غمازی

کرتے ہیں، لیکن عام انداز ایسا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ صورت پیش نہ آئی ہوگی جس کا نتیجہ واسوخت کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے جو جرأت کے یہاں پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ محبوبہ کی بے رخی اور بے اعتنائی کے باوجود کسی دوسرے سے تعلق پیدا کرنے کی دھمکی نہیں دیتے بلکہ محبت میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ ان سے پھر ایک مرتبہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر محبوبہ کوئی بازاری عورت ہوتی تو جرأت بھی "تو نہ سہی اور سہی اور نہ سہی اور سہی" کہہ کر کوئی اور گھر تلاش کر لیتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ آئیے دیکھیں جرأت کا یہ محبوب کون اور کیسا ہے۔

سراپا نگاری شاعری کی ایک خاص صنف ہے اور اس کے مضامین عام طور پر غزلوں میں بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ جہاں غزل میں عشق و عاشقی کی کیفیات اور ہجر و وصل کی واردات کا ذکر کیا جاتا ہے وہاں دو ایک شعر محبوب کے سراپا کے بیان میں بھی صرف کئے جاتے ہیں۔ یہ اس خاص انداز سے مختلف چیز ہے جسے بعد میں لکھنؤ میں بڑا فروغ حاصل ہو کر خارجی شاعری کا نام دیا گیا جس میں محبوب کے خد و خال، اس کے مختلف اعضا، ملبوسات اور جملہ متعلقات حسن کو غزل میں داخل کر لیا گیا۔ یہ مضامین کچھ اس انداز میں ادا کئے گئے ہیں کہ کسی جیتے جاگتے گوشت پوست کے پیکر حسین آدمی کی جگہ ایک مضحکہ خیز صورت کا تصور پیش کرتے ہیں اور بقول حالی ہمارے شاعروں کا یہ محبوب ناممکنات اور محالات کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس انداز سے الگ جرأت نے اپنے محبوب کا تعارف کچھ اس طرح کرایا ہے:-

بال سلجھانا ترا کنگھی سے دل الجھائے ہے — اور بکھرا دیکھ کر بس جی ہی بکھرا جائے ہے
مانگ مانگے دل کو جوڑا بال باندھا چور ہے — چھٹتی ہے چوٹی تو بس دل کیا ہی پیچ کھائے ہے
کیا صفائی سے ترے ماتھے کی نسبت چاند کو — وہ بھی دل پر داغ اسکے عشق کا دکھلائے ہے

وہ کمانیں ہیں بھویں تیری کہ جن کو دیکھ کر   اک جگر پر گھاؤ سا بن تیر ہی لگ جائے ہے
انکھڑیاں جادو ہیں پلکیں برچھیاں بھالا نگاہ   بانکی چتون ہائے تیری دلکو کیا کیا بھائے ہے
سرخ چوٹی دیکھ ڈوری جال میں پھنستا ہے دل   نکلے ہیں کیا کیا ادائیں جبکہ تو شرمائے ہے
تڑپے جوں خشکی میں مچھلی اس طرح عاشق کا دل   دل تڑپ جائے ہے نتھنے جب کہ تو پھڑکائے ہے
رہتے ہیں لعلو سے بن پان کھائے سرخ ہونٹھ   اور چمک دانتوں کی موتی کی لڑی کھلائے ہے
آج تک کانوں سے کان ایسے سنے ہم نے نہیں   چاہ کے حلقے میں بالا دیکھ کر جی آئے ہے
صبح کا تارا خجل ہو دیکھ بندوں کی لٹک   دیکھ سورج یہ جڑاؤ مرکیاں ترائے ہے
۰ پان کھائے تو گلے سے ہوئے ہے سرخی نمود   ایسی گردن سچ ہے لاکھوں گردنیں کٹوائے ہے
ہاتھ اور پاؤں میں ہے یہ چہچہا مہندی کا رنگ   جوں نول بیاہی دلہن کا سا سماں دکھلائے ہے
نورتن کی کیا کہوں بازو پہ جسکے سجتے ہی پھبن   اور کلائی کر کے ہیکل ہاتھ کیا دکھلائے ہے
ابھری ابھری چھاتیاں ہیں سخت ایسی ہی کہ بس   ہاتھ جو آئیں نہیں تو سخت دل گھبرائے ہے
پیٹ ہے میدے کی لوئی، ناف پر اٹکی ہے آنکھ   جبکہ کرتی اچپلاہٹ میں ذرا ہٹ جائے ہے
جبکہ آتا ہے نظر ابھرا ہوا پیڑو وہ آہ   جو ڈھکی ہے بھید اس کا خیر سے کھلجائے ہے
گوری گوری بھاری بھاری ہیں سرین یہ گول گول   چھیڑنے کو جنکے کیا ہاتھ پھسلا جائے ہے
سر سے لیکر پاؤں تک آفت ہے تو تو اے پری   جو تجھے دیکھے ہے جانی اسکو غش آجائے ہے
ناز و انداز و ادا و آن سب ہیں تجھ میں جان   گرمی تیری گفتگو کی سی کوئی کب پائے ہے
ران سے لے پنڈلیوں تک کیا گدازی ہے سو واہ   پاؤں ایسے جو کڑے تک پاؤں پٹپنے آئے ہے
اچپلاہٹ سے سراپا چالیں ہیں اٹھکھیلیاں   سیکھنے تجھ سے سجاوٹ ہر کوئی اب آئے ہے

غش ہوا جاتا ہے جی بس عطر کی بو باس سے
جھٹ سے جرأت کے گلے تو آکے جب لگ جائے ہے

اس میں بھی بعض مضامین رسم، ہیں، کہیں کہیں تشبیہیں اور استعارے

بھی فرسودہ ہیں لیکن بایں ہمہ ان سے ایک ایسی کم سن عورت کا تصور سامنے آجاتا ہے جس کے اعضا متناسب ہیں، جس کا لباس سادہ اور جس کے جسم پر چند گنے چنے زیورات ہیں جو اس زمانے کی عورتیں بالعموم گھروں میں استعمال کرتی تھیں۔ لباس اور زیورات کی تفصیل سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ عورت نا کتخدا ہے کیوں کہ اسمیں محرم کا ذکر نہیں اور اس عہد کے رواج کے مطابق محرم کا استعمال عورت کی شادی کے بعد شروع ہوتا تھا۔ اس سے پہلے صرف ایک سادہ کرتی پہنی جاتی جاتی تھی جو اپنی تراش کے اعتبار سے موجودہ زمانے کے بلاؤز سے ملتی جلتی ایک چیز ہوتی تھی۔ فرق یہ تھا کہ بلاؤز جسم پر چست ہوتا ہے جس سے جسم کی ساخت اور خطوط واضح ہو جاتے ہیں۔ کرتی ایک ڈھیلا ڈھالا لباس ہوتی تھی۔ اور لڑکیاں سینے کے ابھار کو چھپانے کے لئے دوپٹہ کو آگے سے دوہرا اوڑھتی تھیں، چنانچہ ہمارا ایک شاعر کہتا ہے:۔

دوپٹہ کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل

ہمارے شعرا نے محبوب کی نرمی و نازکی کو اس مبالغہ تک پہنچا دیا کہ اسے دھان پان بنا دیا۔ آج بیسویں صدی کا شاعر بھی پکار اٹھتا ہے:۔

صبر لوٹے ہوئے دلوں کا نہ لے تو یونہی دھان پان ہے پیارے

لیکن جرأت کا محبوب دھان پان نہیں، وہ گداز اور گدرایا ہوا جسم پسند کرتے ہیں، ایک شعر آپ پہلے دیکھ چکے ہیں

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا چمپئی رنگ اور بدن اس کا وہ گدرایا ہوا

ویسا ہی جسم اس سراپا میں نظر آتا ہے۔ پورے سراپے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس جسم اور اس کے بیان سے ایک قسم کا لمسیاتی (SENSUOUS) کیف حاصل کرنا چاہتا ہے، درحصل اس لمسیاتی قسم کی لذت کا احساس ہی جرأت

کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ شاعر محبوب کے جسم کو چھونا یا بقول خود چھیڑنا چاہتا ہے اور یہ احساس سراپا کے پہلے شعر سے آخری شعر تک قائم رہتا ہے، ایک موقع اور ایسا آیا ہے جہاں جرأت پھر سراپا بیان کرنے لگے ہیں لیکن انداز ذرا بدل گیا ہے اسے بھی دیکھئے :-

چتون میں لگاوٹ ہیں ہر غضب مژگاں کی جھپک پھر ویسی ہے
دل چھین کے اسکی چینِ جبیں ابرو کی لچک پھر ویسی ہے
کچھ ماتھے پہ بکھرے بال بلا کافر ہی وہ بندش جوڑے کی
مکھڑے ہیں شرارت ٹھہری ہوئی ہونٹوں میں پھڑک پھر ویسی ہے
وہ سرخ ملائم ہونٹ غضب اور اودی وہ مسّی کی دھڑی
دانت انہیں موتی کی سی لڑی ہنسنے میں چمک پھر ویسی ہے
اس بندے کے ہم بندے ہیں وہ بالا سب کو دے بالا
اک موتی کی سمرن ہاتھ میں اور توڑوں کی جھمک پھر ویسی ہے
وہ گردن اسکی صراحی دار اور اس پہ صفائی ہے ظالم
سج دھج میں تمام خوش اسلوبی زیور کی بھڑک پھر ویسی ہے
وہ ابھری ابھری سخت کچیں اور پیٹ ملائم مخمل سا
پتلی سی کمر اس کافر کی جنبش میں لچک پھر ویسی ہے
وہ اونچی گوری گوری سرین وہ کافر رانیں بھری بھری
وہ ساق بلوریں ہوش ربا پاؤں کی کنک پھر ویسی ہے
ہر عضو نزاکت بھرا ہوا اور تس پہ بدن سب گدرایا
قامت ہے قیامت سرتاپا چلنے میں کبک پھر ویسی ہے
ہر آن ہے اسکی آن ہی اور ساختہ ادا کے سب باتیں

ہے ناز و کرشمہ اور غمزہ غمزے کی کمک پھر ویسی ہے
کہہ بیٹھے سب پر اک پھبتی کوئی جگت سو خالی بات نہیں
پوشاک میں بالکل بانک بنا لوندے کی چمک پھر ویسی ہے
وہ چمپئی نازک رنگ اسکا اور بھرے بھرے وہ رخسارے
صورت پہ امنگ جوانی کی چہرے پہ دمک پھر ویسی ہے

یہاں پھر رسمی چیزوں کے باوجود جرأت کی محبوبہ کا حسین پیکر معہ اپنے پورے خد و خال کے نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس سراپا میں کئی باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اس میں ایک خاص قسم کی حرکت اور جوش پایا جاتا ہے جو پہلے سراپا میں نہیں ہے۔ پورے سراپے میں جو چیز پڑھنے والے کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ محبوبہ کی رگ رگ کا پھڑکنا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے ساتھ ساتھ شوخی شرارت اور اچپلاہٹ کوٹ کوٹ کر رگوں میں بھری ہوئی ہے۔ جب بات کرتی ہے تو کسی پر فقرہ چست کرتی ہوئی، اور کوئی فقرہ ضلع جگت سے خالی نہیں، جیسا لباس بانکا ہے ویسا ہی بانکپن گفتگو میں پایا جاتا ہے۔ غرض صورت پر جوانی کی امنگ اور دمک سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ دوسرے یہاں بھی اس لذت یا کیف کا احساس ہوتا ہے جو "لمس" سے حاصل ہو۔ تیسرا، چوتھا پانچواں اور آٹھواں شعر خاص طور پر اس جذبہ کی شدت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ بینائی سے محروم ہونے کے باوجود جرأت بار بار چمپئی رنگ کا ذکر کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مادر زاد اندھے نہ تھے بلکہ رنگوں کی دلآویزی سے آشنا رہ چکے تھے، ہمارے شعرا نے محبوب کے رنگ کے بارے میں عجیب عجیب گل کھلائے ہیں لیکن جس سرخی

یا سفیدی کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ ہندوستان، پاکستان جیسے گرم ملکوں میں نہیں ہو سکتی۔ یہاں کی آب و ہوا اور فضا کو دیکھتے ہوئے سب سے بہتر رنگ جو شاعر کے تصوّر میں آسکتا تھا وہ چنپئی ہے۔ اس سراپا میں بھی "گدرایا" ہوا بدن استعمال کیا گیا ہے جس انداز میں اسے یہاں پیش کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس حصّہ کو بیان کرتے وقت کس قسم کی لذّت لے رہا ہے۔ یہ جذبہ جنسی خواہش کی تسکین سہی اس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں اور جرأت کا یہ بڑا شاعرانہ کمال ہے کہ اس لذّت کا کھلا اظہار نہ کرنے کے باوجود انھوں نے اِس کیفیت کو پڑھنے اور سُننے والوں تک منتقل کر دیا ہے۔ ایک سراپا اور دیکھیئے:-

جادو ہی نگہہ چھب ہے غضب قہر ہے مکھڑا — اور قد ہے قیامت
غارت گر دین و ہ بت کافر ہی سراپا — اللہ کی قدرت
اٹکھیلی ہے رفتار میں گفتار کی کیا بات — ہر بات جگت ہے
اور رنگ رخ یار ہے گویا کہ بھبوکا — پھر اس پہ ملاحت
ہیں بال یہ بکھرے ہوئے مکھڑے پہ دھواں دھا — جوں دود پہ شعلہ
حُسنِ بت کافر ہی خدائی کا جھگڑا — ٹک دیکھیو صُورت
ابرو فن خونریزی میں اسکے ہیں غضب طاق — شمشیر برہنہ
آنکھوں کا یہ عالم ہو کہ آنکھوں سے نہ دیکھا — افسون اشارات
کان ایسے کہ کانوں سے سنے ویسے نہ اب تک — نہ آنکھوں سے دیکھے
بالے کے تصوّر میں مجھے گھیرے ہے گویا — اک حلقۂ حیرت
بینی یہ خوش اسلوب کہ نتھنوں کی پھڑک دیکھ — تڑپے ہے دو عالم
ہے اسکے لب لعل کے بوسہ کی تمنّا — ارمان ہے حسرت

دانتوں کی صفا کیا کہوں موتی کی لڑی ہے　　لب لعل کے ٹکڑے
مسّی ہے بلا تس پہ رکھے پان کا لاکھا　　سو شوخی کی رنگت
دل خون کرے وہ دست حنا بستہ پھر اسمیں　　سمرن کی پھبن ہائے
ہے وضع تو سادی سی یہ کیا کیا نہیں بنتا　　شوخی و شرارت
اس اُبھری ہوئی گات کی کیا بات جسے دیکھ　　سب ہاتھ ملیں ہیں
اور ہائے رے ہر بات میں گردن کا وہ ڈورا　　ہے دام محبت
گلشن میں پھرے ٹک تو وہیں آتش گل کی　　گرمی سے عرق آئے
ہر گام پہ چلنے میں کمر کھاتے ہے لچکا　　اللہ رے نزاکت
ہیں قہر سرین گول اور ہائے کہوں کیا　　زانو کی گدازی
فرق اس میں نہیں فرق سے لے تا بکفِ پا　　ہے طرفہ لطافت
ہے غنوہ و انداز و ادا ناز و کرشمہ　　اور گرمی و شوخی
ہر عضو پہ آنکھ اٹکے وہ کافر ہے گدازی　　ایک موہنی صورت
بھولے سے جو ہم نام لیں تو رُک کے کہے یوں　　اس نام کو کم لو
پھر اسمیں جو رُک جائے ہو تو جھٹ سے یہ کہنا　　بس دیکھ لی اُلفت
جرأت یہ غزل گرچہ کہی ایسی ہی تو نے　　ہے خوب سراپا
پر کہہ کے وہ اشعار کر اب اس کو دوغزلا　　ہو جس سے کہ وحشت

اس کلام میں کئی باتیں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں، سراپا کا موضوع نیا نہیں۔ دکھنی شعراء سے لے کر جرأت کے زمانہ تک طرح طرح سے شعرائے سراپا کے مضامین غزلوں، قصیدوں اور مثنویوں میں نظم کئے ہیں مرثیہ میں اگرچہ سراپا نگاری ضمیر، خلیق اور انیس، دبیر سے باقاعدہ شروع ہوئی

ہے لیکن اس کے عناصر سے بھی پہلے سے موجود ہیں۔ لیکن یہ موضوع جس قدر جرأت کو محبوب ہے شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو رہا ہو، اس کی وجہ صاف یہی ہے کہ جرأت کا محبوب ایسا ہے جس سے وہ ایک لمسیاتی قسم کی لذّت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جرأت کے بعد لکھنوی شاعری میں جب خارجی مضامین کی کثرت ہوئی تو سراپا کے مضامین بھی بڑھ گئے لیکن یہاں ایک بنیادی فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ لکھنوی شعراء کے یہاں ان مضامین کی زیادتی ہے جنکا تعلق ملبوسات، زیورات اور متعلقات حسن سے ہے اور اکثر جگہ ان مضامین کی بھی بنیاد محض کسی رعایت لفظی یا کسی اور صنعت پر ہے جسم اور اس کے مختلف حصّوں کے بیان سے لذّت لینے کے بجائے ملبوسات سے لذّت ناسخ، آتش اور امانت کے یہاں بہت بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً

کسی کے محرم آب رواں کی یاد آئی
حباب کے جو کنارے کبھی حباب آیا

اگرچہ حباب نے آبِ رواں کی مناسبت سے محرم آبِ رواں کی یاد دلائی لیکن تعجب ہے شاعر صرف محرم کی یاد تک پہنچکر رہ جاتا ہے۔ اس عہد کے تمام شعراء بجائے سینہ کے محض چولی اور محرم کے بیان میں زیادہ اُلجھے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ ایک قسم کی جنسیاتی لپسپائی کی علامت ہے جو اس دور کی شاعری میں طرح طرح سے ظاہر ہوتی ہے۔ علاوہ اور اسباب کے ریختی کے رواج اور اس کے خالص لکھنوی انداز میں اس جنسیاتی پسپائی کا بھی دخل ہو جہاں مردوں نے مردانہ اظہار عشق کی جگہ عورتوں کی زبان میں ان کے جذبات ہوس ادا کئے ہیں، یہ منظر اس زمانہ میں کوئی عجیب نہ تھا کہ ریختی گو مرد شعرا عام محفلوں میں زنانے کپڑے پہنکر شامل ہوتے تھے اور عورتوں کے سے چوچلے اور نازنخرے دکھاتے تھے۔ جرأت کی ہوس پرستی کم از کم ایک صحت مند جسم

اور صحت مند ذہن کی ترجمانی تو کرتے ہیں۔

یہ تو محبوب کا سراپا ہوا۔ آیئے دیکھیں اس کی عادات اور اطوار کیسے ہیں

ایک غزل میں روٹھے ہوئے محبوب کو منانے کی کوشش کرتے ہیں اور منت و زاری سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس خفگی کا کیا باعث ہو سکتا ہے

نہیں کرنے کا رُسوا تجھ کو مجھ سے رُوٹھ مت جانا
جو پھر محفل میں روؤں تو مری آنکھیں نکلوانا
کروں گر بزم میں پھر حشر برپا آہ و نالے سے
تو پھر مجھکو قیامت تک تو اپنا موٗنھ نہ دکھلانا
ترے قربان جاؤں لے گلے لگ جا کہ لوگوں میں
بلائیں پھر تری لے لوں تو میرے ہاتھ کٹوانا
کسی کا ہوں گریباں گیر گر اب کے ترے در پر
تو پھر صاف اے پری رو جانیو تو مجھکو دیوانا
جواب محفل میں تجھکو تک رہوں یوں چشم جرأت سے
تو پھر جس طرح سے چاہے تو آنکھیں مجھکو دکھلانا
گمان بد سے آپ ہی آپ گر پھر روٹھ جاؤں میں
نہ صورت دیکھنا میری قیامت مجھ پہ فرمانا
بگڑ کر اب ترے گھر میں کسی کو گر نہ آنے دوں
تو پھر رکھیو گوارا تو نہ در تک بھی مرا آنا
جو پھر دیکھوں تجھے لوگوں میں میٹھی میٹھی نظروں سے
تو اس شیریں زباں موٗنھ میں جو کچھ آوے سو فرمانا
جو پھر بھر بھر کے ٹھنڈی سانس میں تجھ سے لگا چاہوں

تو میری گرمیٔ صحبت سے تو اے جان گھبرانا
رُباعی یا غزل میں صاف تیرا نام پھر لاؤں
تو اے پیارے زباں پر نام تو میرا نہ پھر لانا
اگر اب لوٹ جاؤں پاؤں پر اُٹھنے میں میں تیرے
تو پھر محفل میں تو مجھکو نہ بٹھلانا نہ بٹھلانا
پڑھوں اشعار جو آتے کے اگر پھر حسب حال اپنے
تو حرفِ زیست میرا صفحۂ ہستی سے مٹوانا

اس عہد و پیمان سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کے روٹھنے کا سبب دراصل عاشق کا طرح بے طرح، وقت بے وقت اور موقع بے موقع اظہار شوق ہے، خلوت ہو یا جلوت وہ اپنا دردِ دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس طرح محبوب کو رسوائی، بدنامی اور طعنہ زنی کا خطرہ ہے۔ پھر عاشق بدگمان بھی ہے وہ دوسروں سے محبوب کا ملنا جلنا پسند نہیں کرتا، یہی نہیں کہ وہ اپنی بدگمانی کو دل میں رکھتا ہے یا اس کا اظہار کرتا ہے بلکہ آپ ہی آپ رُوٹھ جاتا ہے جب کہ بظاہر روٹھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، ایسے اشعار پڑھتا ہے جو اس کے حسب حال ہوتے ہیں۔ بلکہ غزل اور رباعی میں صاف صاف محبوب کا نام لینے میں بھی اسے تامل نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے محبوب یہ سب باتیں آسانی سے گوارا نہیں کرسکتا۔ عاشقی بے تاب سہی اور نام و ناموس حرفِ غلط لیکن محبوب سوسائٹی کی روایات سے آزاد نہیں ہے۔ اسے اپنی بدنامی کا بھی خیال ہے اور اعزّہ و اقربا کی طعن و تشنیع کا بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق ایک ایسے سماجی نظام میں ہیں جہاں مرد عورت کی محبّت کو شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے اور اسے گناہ کی طرح چھپایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ

ایک اعلیٰ درجہ کی اخلاقی اقدار رکھنے والی سوسائٹی ہے۔ لیکن دراصل ایسا سماج ہے جو اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں چور ہے جو کچھ کرتے ہیں چوری چھپے کرتے ہیں۔ جرأت یہاں یہ نہیں کہتے کہ وہ محبّت کرنا چھوڑ دیں گے یا قطع تعلق کر لیں گے، وہ بس ان باتوں سے توبہ کرتے ہیں جن سے ان کی محبّت کا راز فاش ہو اور لوگ اُن کے تعلقات سے آگاہ ہو جائیں۔ اس پردہ داری کی کوشش اور ظاہر پرستی نباہنے کے عہد و پیمان سے پھر ایک دفعہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جرأت کا محبوب کون تھا اور اس سے ان کے کس قسم کے تعلقات تھے۔

اب اس محبوب کی عادات و اطوار کا جائزہ لیجیے۔ پہلے دیکھیے کہ مبتلائے عشق ہونے سے پہلے عاشق کس قدر طمینان اور بے فکری سے اوقات بسری کر رہا تھا اور دل لگانے کو ہنسی سمجھتا تھا یا اسے زیادہ سے زیادہ دل بہلانے کی ایک صورت سمجھتا تھا، ایک غزل میں اس زمانہ کو یوں بیان کیا ہے :۔

جستجو میں دل کے بہلانے کی جی کھونا پڑا — جو ہنسی کی بات تھی سو اس کا اب رونا پڑا
کوئی دل مانگے تھا تو کہتے تھے ہم منہ دھو رکھو — سو یہ کہتے کہتے اب اشکوں سے منہ دھونا پڑا
بارہا باتوں میں باغ سبز دکھلائے جنہیں — انکی خاطر کشت دل میں تخم غم بونا پڑا
پڑھ کے منتر پھونکتا تھا جو کسی کے منہ پہ میں — سو وہ اُلٹا ہو کے میرا مجھ پہ ہی ٹونا پڑا

نقد دل اپنا لگا یوں جرأت اسکے مفت ہاتھ
راہ چلتے جس طرح پا دے کوئی سونا پڑا

محبوبہ کی اس کشیدگی میں کچھ مدعی کی کرم گستری بھی شامل ہے چنانچہ لکھتے ہیں :۔

کہوں کس سے مصیبت اپنی جاکر کیا کروں یا رب
یہ کل کی بات ہے اک مُدعی اس کو سجھاتا تھا

تجھے جرأت کی بھی باتوں پہ تھا کچھ دھیان لے ناداں
کہ تجھ کو دیکھ کر کیا کیا وہ شکل اپنی بناتا تھا

کبھی حیرت سے تک رہتا تھا تیرے منہ کو محفل میں
کبھی اُٹھنا ترا دریافت کرکے تلملاتا تھا

کبھی رکھتا تھا دل پہ ہاتھ گاہے سر کو زانو پر
کبھی بھرتا تھا آہیں اور کبھی آنسو بہاتا تھا

کرے ہے تجھکو رسوا سب یہ باتیں اس کی خاطر ہیں
کہ وہ تیری اور اپنی چاہ لوگوں کو جتاتا تھا

آغاز محبت کے بعد ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ چونکہ بات چھپے چوری ہوتی تھی اس لئے اقربا اس سے آگاہ نہ ہوئے اور دونوں نے بلا روک ٹوک آنا جانا شروع کر دیا لیکن وہ محبوب عاشقی کی لذّت سے آشنا نہ تھا، اس لئے اس نے زیادہ التفات نہ کیا، آہستہ آہستہ اس پر عشق کا جادو چل گیا اور اسکے دل میں بھی آتش شوق بھڑک اٹھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ راز محبت افشا ہو گیا روک ٹوک شروع ہوئی، دونوں کا ملنا جلنا تو بڑی بات ہے اس کی اجازت نہ رہی کہ کوئی یہاں کا آدمی وہاں جائے یا وہاں کا آدمی یہاں آئے، نامہ نہ پیام کا بھی اس طرح کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ چنانچہ ہجر کے آلام نے لپیے صدموں سے چور کر ڈالا۔ جرأت نے ان تمام حالات کو ایک غزل کے چند اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے :-

کہوں قسمت کی کیا خوبی عجب طالع کی شامت ہے
محبت میں بگڑتا ہے یونہی کیا کام انساں کا

نہ باہم نامہ و پیغام ہے نہ جا سکوں ہوں میں

نہ آنا یاں کسی صورت سے ہو سکتا ہے جاناں کا
تماشا ہے کہ جن روزوں میں اس کے اقربا خوش تھے
تو نا حق بھی سر گیا تھا مجھ سے دل اس آفتِ جاں کا
ہوا وہ خوش تو اب لوگوں نے آ کر یہ منادی کی
نہ وہاں جائے کوئی یہاں کا نہ یہاں آئے کوئی وہاں کا
کیا اس عشق کی وحشت نے کیا دیوانہ جرأت کو
عجب احوال دیکھا ہم نے کل اس خانہ ویراں کا
پڑھے تھے موئے سر تا پا لباس تن تھا عریانی
بچھایا خاک پر تھا بستر اخارِ مغیلاں کا
کبھی اٹھ دوڑتا تھا وہ کبھی لوٹے تھا کانٹوں پہ
نہ تھا کچھ ہوش اس وحشی کو اپنے جسمِ عریاں کا
نہ کرتا تھا کسی سے بات ہرگز اک مگر مطلع
یہی وردِ زباں تھا اس مریضِ دردِ ہجراں کا
کچھ ایسا کر گیا بے ہوش جانا ہم کو جاناں کا
نہ جی کو ہوش ہے دل کا نہ دل کو ہوش ہو جاں کا

ایک اور مسلسل غزل میں بھی انھوں نے ان واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور انداز کچھ ایسا ہے کہ پڑھنے والا ان اشعار کو محض رسمی کہہ کر سرسری طور پر نہیں گزر سکتا۔

بھول گئے تم جن روزوں ہم گھر میں بلائے جاتے تھے
ہوتے تھے کیا کیا چرچے عیش منائے جاتے تھے
میخواری دل داری تھی اور صحبت لطیف ہر باری

ہو کر کیف ہونٹوں سے پھر ہونٹ ملائے جاتے تھے
کیا کیا کچھ تھی خاطر داری کیا کیا پیار کی باتیں تھیں
کس کس ڈھب سے چاہ جتا کر ربط بڑھائے جاتے تھے
اُٹھنے کو ہم پاس سے دن بھر دل نہ تمھارا چاہتا تھا
ہوتے تھے جو مخل ہمارے سو وہ اُٹھائے جاتے تھے
کیا کیا تم کو سوجھتی تھی اور کیا کیا ہم کو سوجھتی تھی
ڈھب ملنے کے جب آپس میں کچھ ٹھیرائے جاتے تھے
کرتے تھے تم ان کی خوشامد جو تھے ہمارے محرم راز
ہر ہر بات پہ کیا کیا ناز ان کے اُٹھائے جاتے تھے
لگ زانو سے بیٹھے پہروں آنکھیں نیچی کرکے اور یہی
چاہ جتانے کے پردے میں ڈھب سکھلائے جاتے تھے
وصل کی شب کی ہوتی تھی جب صبح تو دل سے کھینچ کے آہ
ہم کہتے تھے گھر جاتے ہیں تم گھبرائے جاتے تھے
خاک پہ بھی کوچہ کی اب اپنے لوٹنے دیتے تم نہیں آہ
یا کہ ہماری خاطر کیا کیا فرش بچھائے جاتے تھے
حرف محبت دل سے مٹا کر ہم کو رولاتے ہو تم اب
شعر کبت یا ہم سے پڑھ کر اشک بہائے جاتے تھے
پیتے ہیں اب خون جگر ہم یاد وہ گل رنگ کرکے آہ
اپنے سر کی دے دے قسمیں جام پلائے جاتے تھے
بات نہیں تم کرتے ہو اب یہ ہے خوبی طالع کی
کرنے کو منہ بند ہمیشہ کے قفل پڑھائے جاتے تھے

نقشہ بدلا صحبت بگڑی ورنہ ہمارے دکھانے کو
کیا کیا پہن کے پوشاک اپنے روپ بنائے جاتے تھے

ننگ ہے اب اس نام سے ایسا جہاں لکھا ہو مٹوا دو
یا پڑھنے کو جرأت کے شعر لکھائے جاتے تھے

عشق جب جنسیاتی لگاؤ کی صورت اختیار کرے تو دو ہی نتیجے برآمد ہو سکتے ہیں یا تو شاعر جنسی آسودگی حاصل کر لیتا ہے یا اس سے محروم رہتا ہے۔ پہلی صورت کے جذبات اور حالات کی مثالیں بوس و کنار کے سلسلے میں پیش کی جا چکی ہیں۔ دوسری صورت میں ایسے اشعار نظم ہوتے ہیں جن میں ہجر و فراق کی کیفیات بیان کی گئی ہیں۔

نیند بھی اڑ گئی یارب یہ ہوا مجھ کو کیا
میں تو حیراں ہوں یہ روگ لگا مجھکو کیا

کچھ الم کچھ درد ہے کچھ سہو ہے کچھ محو ہے
بھول جاتا ہے تیرا بیمار اُٹھنا بیٹھنا

بہہ چلا چشم سے یک بار جو دریا سا
بیٹھے بیٹھے مجھے کیا جانے یہ لہر آئی کیا

جرأت کے وقت آخر پوچھا جو یہ کسی نے
ہوشیار ہو کے ہو ہو یوں مفت جان کھونا

تو وہ مریضِ اُلفت رو کر بقولِ سودا
کہنے لگا کہ ناداں کیا پوچھتا ہے ہونا

حقیقت دردِ دل کی پوچھتے کیا ہو نہ کچھ پوچھو
یہ حالت ہے کہ سینہ کو ذرا چھیڑا نہیں جاتا

سینہ کے زخم سے جو ہیں پھاہا سرک گیا
دل آبلہ سا آنکھوں کے آگے جھلک گیا

پیغام کہنا مرا یار سے
اگر وہاں تو لے نامہ بر جائے گا

ترے غم سوا اک شخص ہے جاں بلب
وہ بچ جائے گا تو اگر جائے گا

جو مانے تو مانے نہیں تو نہیں
گزرنا ہے جو کچھ گزر جائے گا

یہی دردِ غم ہے تو جرأت کا جی
نہیں شام اگر تو سحر جائے گا

رات کیا کیا ملال نہ تھا
خواب کا تو کہیں خیال نہ تھا

آج کیا جانے کیا ہوا ہم کو / کل تک ایسا تو جی نڈھال نہ تھا

بولے سب دیکھ میری جاں کا روگ / یہ تو فرہاد کا بھی حال نہ تھا

اس کھیت کا سا مزرعہ دل کا ہوا ہے حال / جس کشت کا کہ کہتے ہیں ہر دانہ جل گیا

زباں پہ نہ جو حرف غم لائے گا / تو گھٹ گھٹ کے اک روز مر جائے گا

سمجھتے نہیں دل دہی کا نتیجہ / کہ دن رات سینہ کو سہلائے گا

نہ عاشق کسی پہ ہو اے حضرت دل / نہیں آپ اپنا کیا پائے گا

جو درد و غم سے جان و جگر پہ گزر گیا / گزرا نہ رہزنوں سے کسی کارواں پہ

سننے سے قصۂ مجنوں کے یہ خاطر میں آتا ہے / یونہی مر جائیں گے ہم بھی جفا و جور سہہ سہہ کر

ہمدمو بیتابی دل مت پوچھو / اب تو یہ حال ہے مرا کہ موا جاتا ہوں

سنتا ہے کون کس سے کہوں درد بیکسی / ہمدم نہیں ہے کوئی مرا ہمنشیں نہیں

پوچھتا ہوں تجھے اے اہل جہاں میں غم زدہ / اتنا بتلا دو جہاں میں ہے دل خورم کہیں

یہ حسرت جو ہم دم بدم دیکھتے ہیں / نہیں دیکھتے تم یہ ہم دیکھتے ہیں

عجب درد فرقت سے غم دیکھتے ہیں / نہ سنتے تھے کانوں سو ہم دیکھتے ہیں

عشق کے صدمے سے اب تو جی گھٹا جاتا ہے آہ
ایک پھوڑا ہے کلیجہ پر کہ بڑھتا جائے ہے

اس قسم کے اشعار سے کلیات بھرا پڑا ہے اور ان کی تعداد ان مضامین کے مقابلہ میں جن کو چھا چالی کہا گیا ہے خاصی ہے، اس لئے جرأت کے کلام پر فیصلہ دیتے وقت ناقدین کا ان اشعار کو نظرانداز کرنا ادبی تنقید میں ایک بددیانتی کے مترادف ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جرأت کے زمانے میں ہی ان کا کلام اچھی خاصی مقبولیت حاصل کر چکا تھا اور وہ ان محفلوں میں جہاں میر جیسے شعرا موجود ہوتے تھے اپنے کلام کی خاطر خواہ داد پا لیتے تھے۔ قدرت اللہ قاسم

نے مجموعہ نغز میں جو روایت لکھی ہے اور جسے نقل کیا جا چکا ہے۔ اگر وہ صحیح بھی ہے تو بھی اس دعوے کی تائید ہوتی ہے، کسی بڑے مشاعرے میں ایسی داد ملنا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے کچھ نہ کچھ کلام کی تاثیر اور قبول عام کا سُراغ دیتی ہے اور یہ پھر اس زمانے کے مشاعرے تھے جب عام طور پر تحت اللفظ پڑھنے کا رواج تھا اور آجکل کے بعض شعرا کی طرح محض ترنم کی بیساکھیاں لگا کر شاعر مشاعرے کے میدان نہیں مار سکتے تھے۔

اب تک جرأت کے کلام میں جن مضامین کا جائزہ لیا گیا ان کا تعلق براہ راست عشق و عاشقی سے تھا لیکن غزل کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انہیں بیحد تنوع پایا جاتا ہے۔ عشقیہ مضامین سے قطع نظر غزل میں ہر قسم کی واردات قلبی کا اظہار ہوتا ہے اور اس اعتبار سے اصناف سخن میں غزل سب سے زیادہ شاعر کی ذات اور اس کی داخلی کیفیات کی ترجمان کہی جا سکتی ہے اسی لیے غزل میں شاعر کی شخصیت کے نقوش جتنے اجاگر ہوتے ہیں اتنے کسی دوسری صنف میں مشکل سے نظر آتے ہیں۔ اگر ہمارے پیش نظر غزل گو شاعر کے تاریخی سماجی، ذہنی اور تمدنی پس منظر کے ساتھ ذاتی واقعات اور واردات کی تفصیل بھی موجود ہو تو ہم بڑی آسانی سے مختلف غزلوں اور غزلوں کے اشعار کو زندگی سے ربط دے سکتے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں اس کی سب سے بڑی مثال میر تقی میر کی شخصیت اور شاعری ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اور پھر آخر عمر میں جو افتادیں اُن پر پڑیں ان کی تفصیل ذکر میر میں موجود ہے۔ جو درد، سوز و گداز، مایوسی اور ایک قطعی قسم کی الم نصیبی اور یاس پرستی جو ان کی غزلوں میں جلوہ گر ہے درحقیقت ذکر میر کی ہی تفسیر اور تشریح ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ذکر میر کے انداز بیان نے حالات اور واقعات کو ذاتی اور

انفرادی رنگ دیدیا ہے۔ غزل میں اندازِ بیان کی ہمہ گیری نے اسے بڑی وسعت دیدی ہے اور ہم میں سے ہر شخص کو میر کی آپ بیتی جگ بیتی سی معلوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں تو یہ دھوکہ ہونے لگتا ہے کہ میر نے یہاں اپنے جذبات کی جگہ ہمارے دلوں کے دُکھتے زخم اور رستے ہوئے ناسور چھیڑے ہیں۔ جرارت کے ماحول کی تصویر آپ کے سامنے ہے اور ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات سے بھی آپ آشنا ہو چکے ہیں۔ آئیے اب اس قبیل کو کلام کا مطالعہ کریں :-

دم بدم یاں نیا ہی عالم ہے　　خوب عالم کو غور کر دیکھا
اک نہ اک بات کا ہو سب کو فکر　　اس سے خالی نہ اک بشر دیکھا
باتوں سے کٹے کیسکے بھلا راہ ہماری　　غربت کے سوا کوئی نہیں ہم سفر اپنا

قفس میں ہم صفیرو کچھ تو مجھ سے بات کر جاؤ
بھلا میں بھی کبھی تو رہنے والا تھا گلستاں کا

اب ہم ہیں اور شامِ غریبی کی دید ہے
مدت سے وہ نظارۂ صبحِ وطن گیا!

یارو جہاں میں اب کہیں دیکھی وفا کی چال
جانے دو یہ نہ ذکر کرو وہ چلن گیا

ہم اسیرانِ قفس کیا کہیں خاموش ہیں کیوں
راہ لے اپنی چل اے بادِ صبا تجھ کو کیا

بسان کشتیٔ طوفان خوردہ بحرِ ہستی میں
کہیں ٹھہرا جو چا ہوں میں تو پھر ٹھہرا نہیں جاتا

قفس کو ہم صفیرو کر دکھاتے رشکِ گلشن ہم

و لے ناطاقتی سے کیا کریں تڑپا نہیں جاتا

خجل ہوں باغباں سے میں نہالِ خشک ہوں ایسا
نہ بیٹھا کوئی سایہ میں نہ کچھ مجھ سے ثمر پایا

بستا تھا کب قفس یہ صیاد اس طرح کا
ہے اپنے دم قدم سے آباد اس طرح کا

جب خاک نہیں چمن میں تب ہم قفس سے چھوٹے
کس کام آئے ہونا آزاد اس طرح کا

تھی جائے عیش و عشرت اب خاک بھی نہیں ہر
کوئی نگر کرے ہے برباد اس طرح کا

صیاد نہ کر منع کہ گلشن کی ہوس میں
تڑپیں نہ یہ تو مُرغ گرفتار کیا کریں

جہاں کچھ درد کا مذکور ہوگا
ہمارا شعر بھی مشہور ہوگا

اب تو ہم ہیں اور ہے کنجِ قفس کی بود و باش
تھا کبھی صحنِ چمن بھی اپنا مسکن اے صبا

چشم وا کرتے ہی نرگس کی طرح کملا ئے
چمن دھر کا کچھ ہم نے نظارہ نہ کیا

بھلا ہوا نہ ہوئے گل چمن کے ہم ورنہ
ہزار رنگ سے یاں خزاں کا ڈر ہوتا

صیاد ٹک قفس کی خبر لیجیو شتاب
ہے کیوں خموش مرغ گرفتار کیا ہوا

اب ملے صیاد ڈھونڈے سے کہاں وہ اڑ گیا
جس کا دیر لے کی صورت آشنا نا بن گیا

رہے قفس ہی میں ہم اور چمن میں پھر پھر کر
ہزار مرتبہ موسم بہار کا پہنچا

وائے قسمت نہ قفس کے ہوئے نہ گلشن کے
کہ رہا اب ہمیں صیاد نے پر بند کیا

ہیں باغِ جہاں میں شجرِ سوختہ ہوں گا
کیسی ہی بہار آئے نہ پھولوں نہ پھلوں گا

ہم اس طرح رہے یارانِ رفتگاں سے دور
غریب جوں کوئی رہ جائے کارواں سے دور

بسانِ بلبلِ دور از چمن فتادہ اب آہ
پڑے تڑپتے ہیں ہم بزمِ گل رخاں سے دور

چمن دکھایا نہ صیاد نے کبھو ہم کو
رکھا قفس کو بھی دیوارِ گلستاں سے دور

جو پاس پاس چمن میں دکھا رہے تھے بہار
وہ پہنچے برگِ گل اب صرصرِ خزاں سے دور

یہ اشعار خود اپنے فنکار کی ترجمانی کرتے ہیں اور ہم بغیر کسی تشریح اور تفصیل کے انہیں ان حالات اور واقعات سے ربط دے سکتے ہیں جو مذکور ہوئے، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص گھٹی گھٹی فضا میں سانس لے رہا ہے، اجنبی ماحول ہے اور اس میں سب سے شدید احساس شاعر کو اپنی تنہائی کا ہے جسے وہ بار بار نئے استعاروں اور تشبیہوں میں بیان کرتا

چاہتا ہے۔ یہ تنہائی کس قسم کی تھی اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ بصارت کی محرومی نے انھیں بڑی حد تک سوسائٹی سے الگ کرنا چاہا ہو اور اس نے تنہائی کے احساس کو شدت بخشی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تنہائی ایک نئے دیس اور نئے لوگوں میں رہنے سہنے سے محسوس ہوئی ہو اور جرأت جو دلی کی روایات میں پلے اور بڑھے تھے، لکھنؤ کی محفلوں میں شریک ہونے کے باوجود خود کو غریب شہر سمجھتے ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تنہائی جنسی قسم کی ہو کیونکہ ان کے کلام میں جنسیاتی میلانات کے مطالعہ نے ہم پر واضح کر دیا ہے کہ اس معاملہ میں وہ غیر معمولی حساس تھے۔ اگر انھیں جنسی تعلقات اور جنسی آسودگی حاصل کرنے میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور اسکی تلافی انھوں نے اپنے مضمون میں بوس و کنار سے کر لی یا انھیں کامیابی تو ہوئی لیکن ان کے ظرف کے مطابق بادہ نہ ملا۔ بہر حال ہم کوئی صورت فرض کر لیں یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جرأت کو اپنی زندگی میں کوئی خلا یا کمی ضرور محسوس ہوتی ہے اور وہ اسے پُر کرنے یا دور کرنے کے لئے حتی الامکان جد و جہد کرتے ہیں۔ ان مضامین کا لہجہ یاس انگیز ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہد میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، اس لئے وہ بار بار خود کو مرغ آہ اور مرغ گرفتار کہتے ہیں لیکن ایسا مرغ جو اپنی گرفتاری پر صبر و شکر کرکے نہ بیٹھ گیا ہو، بلکہ برابر تڑپ رہا ہو۔ اگر کسی وقت اس اضطراب یا تڑپ کی آجاتی ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ راضی برضا ہو جاتے ہیں بلکہ محض ناتوانی اور بے بسی کی وجہ ہے۔

یہ رنگ اس سیاسی خلفشار کے ماحول کی بھی پوری ترجمانی کرتا جس میں اقتدار صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں تھا اور دوسرے محض انکے دستِ

دولت تھے، پھر ان کے عروج کو بھی ثبات یا قرار نہ تھا، اس لئے ہر شخص پہ
ہر وقت ایک قسم کی بے اطمینانی اور گھبراہٹ طاری رہتی تھی۔ اس میں
فنکارانہ صلاحیت رکھنے والے لوگوں کے لئے گھٹن اور کرب محسوس کرنا کوئی
تعجب کی بات نہیں، یہ لَے وہی ہے جو میرؔ، دردؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ
سب کے یہاں ملتی ہے۔ دردؔ صوفی تھے۔ میرؔ اور مصحفیؔ کی طبیعت میں سوز و
گداز اور سکینیت تھی لیکن سوداؔ اور انشاؔ دو ایسے شخص ہیں جنہوں نے بجید
شگفتہ طبیعت پائی تھی اور کوشش کر کے اپنے لئے کم از کم وقتی طور پر نشاط
احول بھی مہیا کر لیا تھا۔ لیکن ان کے کلام میں بھی جگہ جگہ درد کی کسک ہی نہیں
یس اور تڑپ ملتی ہے۔

غزل ہو یا کوئی دوسری صنف شاعری میں اکثر مقامات ایسے آتے ہیں
ہاں فنکار خود کلامی کرتا ہے۔ کبھی تو وہ ایسی باتیں خود اپنے دل سے کرنے لگتا
ہے جنکو وہ دوسروں کے سامنے کہنا نہیں چاہتا یا دوسرے اس کو سمجھ نہیں
سکتے وہ راز جو اس کے سینے میں تڑپتے ہیں، رخصت اظہار چاہتے ہیں لیکن
سے ہم کلام نہیں ملتا۔ درصل انھیں لمحات میں دل کی ان گہرائیوں سے گہرائو
یاب نکلتے ہیں جہاں تک کسی غواص کی رسائی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی جنکے
ودسے خود صاحب کلام بھی باخبر نہیں ہوتا۔ لیکن ایک مرتبہ جب یہ آب دار
ی گفتار کی سطح پر آجاتے ہیں تو اپنی آب و تاب اور چمک دمک سے نظر
خیرہ کر دیتے ہیں اور شعر و ادب کی دنیا میں ادبی شاہ کار بنکر رہ جاتے
ں۔ کوئی شاعر جسے فنی اعتبار سے صف اوّل میں شمار کیا جا سکتا ہو ان سے
دوم نہیں ہوتا، البتہ ان کی کمی زیادتی سے فرق مراتب ضرور پیدا ہو جاتا
۔ قلی قطب شاہ، ولیؔ، میرؔ، مصحفیؔ اور ہمارے زمانے میں حسرت موہانی

کے یہاں ایسی دبی ہوئی چنگاریاں ہیں جنھوں نے انکے کلام میں فروغ جاودانی پیدا کر دیا ہے۔ جراءت جو بصارت سے محروم ہو چکے تھے، جنھیں بچپن میں یتیمی کا صدمہ سہنا پڑا تھا، جنھوں نے دلّی کی رنگین گلیوں کو چھوڑ کر پورب کے ویرانے میں پناہ لی تھی۔ اگر بار بار اس طرح اپنے دل سے باتیں کرنے لگتے ہیں یا خود کو سمجھانے لگتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں

صحرا کے بیچ رہتا کیوں کارواں سے چھٹ کر — گر آج کوئی ہوتا مجھ سے شکستہ پا ک
اے وائے کہ موسم میں ہم آواز ہمارے — پرواز میں مصروف ہیں اور ہا تو نہیں ہ
یا رب تو خیر کیجیو پھر پھر کے باغباں — کرتا ہے کیوں نگاہ میرے آشیاں پہ
سننے سے قصۂ مجنوں کے یہ خاطر میں آتا ہو — پہ نہیں مرجائینگے ہم بھی جفا و جور سہہ سہہ ک
قلق گزرے ہے دل پر اور افزوں شعر خوانی سے — جو بہلانیکو دل کے دفتر اشعار دیکھیں ہ
شعلۂ ناتوان کے مانند — ہاتھ میں تیرے لیے صبا ہیں ہ
گر یہی ہے ہوا یہاں کی تو آہ — اب کوئی آن میں ہوا ہیں ہ
مرگ سوجھے ہے آج کل مجھ کو — بے کلی سے نہیں ہے کل مجھ ک
غم ہجراں سے دل گیا شاید — خالی لگتی ہے کچھ بغل مجھ ک
دل ہی جس کا عدو نے جانی ہو — کیوں کہ پھر اس کی زندگانی ہ
ٹک فصل گل میں رخصت پرواز ہمکو دے — کہہ دو کوئی یہ بہرِ خدا باغبان س
کیا کیا بیاں کروں دل وحشی کی حالتیں — وحشی ہوا دوانہ ہوا باؤلا ہو
دماغ بادۂ خواری ہمکو تھا کبھی اب آہ — فراغ کسکو ہے خون جگر کے پینے سے
اپنے تئیں میں نہیں پہچانتا — غم نے حالت اس قدر تغییر ک
گل لائے ہزاروں ہیں شجر اور ثمر بھی — کچھ کرم اے بادِ بہاری ٹک ادھر بھ
اس صید گرفتار کی کیا کہیے کہ ہیہات — سونپے ہو قفس میں جسے اور توڑے ہو پر ن

دلِ وحشی کو خواہش ہے تمھارے در پہ آنے کی دیوانہ ہے و لیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی
عشق کے صدمہ سے ابتو جی رکا جاتا ہے آہ ایک پھوڑا ہے کلیجہ پر کہ بڑھتا جائے ہے
بہار آئی پہ صیاد نے رہا نہ کیا اگرچہ ہمنے قفس میں ہزار پر مارے
نہ ہمدم کوئی ہے نہ اب ہمنشیں ہے برے وقت کا کوئی ساتھی نہیں ہے
رشک آتا ہے جب کہے ہے کوئی میں نے اک قدر داں پایا ہے
ہمنے تو آج تک نہ کوئی شفیق نہ کوئی مہربان پایا ہے
کیا آزاد سبکو اک مجھی کو دام میں رکھا نہیں معلوم خوبی مجھ میں کیا صیاد جانے ہے
عزیزو باغباں سے تم خزاں کا جور مت پوچھو کہ اس بیداد کو میرا دل ناشاد جانے ہے
جب کبھی نکہت گل سوئے قفس آتی ہے کیا کہیں جو ہم اسیروں کو ہوس آتی ہے
دام سے چھوٹے تو کیا فائدہ اے قسمت بد عین موسم میں خزاں اب کے برس آئی ہے
جس کا نہ یار کوئی ہووے نہ ہمدم ہووے اس کی تنہائی کا پھر کس کے تئیں غم ہووے
گل کو کیا غم ہو اگر بلبل بے کس نہ جیئے ہاں مگر گریہ کناں آن کے شبنم روئے
رنگ گلشن ہے نت بنوعِ دگر ہے عجب سیر دیکھے گر کوئی
کل جو پرواز میں تھا مرغِ چمن آج اڑتا نہیں ہے پر کوئی
ہاں وہ مرغِ چمن اور وہ چہچہے اس کے گر شکستہ پری اس کے آشیاں پر ہے
ہمت کی ہے یہ خوبی کہ جب آئی فصلِ گل تب باغباں نکالے ہے گلزار سے مجھے
وہ صید ناتواں ہوں کہ آخر سمجھ کے کچھ صیاد نے بھی چھوڑ دیا دام سے مجھے

کیا کروں بے رحمیٔ صیاد کا جرأت گلہ
دام سے چھوڑا تو چھوڑا توڑ کر بازو مجھے

یہ تمام اشعار جرأت کی مختلف ذہنی کیفیات (MOODS) کی ترجمانی کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماحول کا ردِّ عمل ان کے ذہن نے کس انداز سے

قبول کیا ہے اور اس طرح ان کی مدد سے ان کی زندگی کے تمام نقوش اُبھر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

بعض اور مضامین ایسے ہیں جنہیں کم و بیش تمام غزل گو شعراء نے نظم کیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ غزل کے عام موضوعات میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان میں ایک عام موضوع شراب ہی، بلکہ بعض لوگوں نے تو غزل کو ذکر شاہد و شراب ہی کہا ہے۔ اسے براہ راست فارسی شاعری بالخصوص فارسی غزل کا اثر سمجھنا چاہیئے۔ ایران کی آب و ہوا، وہاں کے رسم و رواج اور ماحول نے نہ صرف شراب نوشی کی اجازت دی بلکہ اسے وہاں کی تہذیب و معاشرت کا جزو بنا دیا۔ اور وہ تمام کیفیات جو شراب کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں، شاعری کا موضوع بن گئیں۔ شراب نوشی کے لوازمات، بادہ، مینا، بوتل، صراحی اور ان کے متعلقات گردن مینا، قلقل مینا، پنبہ بادہ سب آ گئے۔ شراب پلانے کے لئے ساقی کی ضرورت ہوئی اور اس کے لیے حسین اور نوخیز غلام تجویز ہوئے۔ سرور کے عالم میں ان کے آتش حسن نے جذبات شوق پر اور تازیانہ کا کام دیا اور ان کی ساقی گری محبوب کی عشوہ طرازی بن گئی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ساقی اور محبوب مترادف ٹھیرے۔ اس طرح شاعری میں ہزاروں موضوعات، حالات، کیفیات اور جذبات کا اضافہ ہو گیا۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہندوستان میں شراب نوشی کا رواج نہ تھا۔ اس کے برعکس آریوں کے زمانہ سے ہی سوم رس کے نام سے ایک شراب کا رواج عام تھا اور اکثر مذہبی رسوم کی ادائیگی میں اسے بطور جزو لازمی شامل کیا جاتا تھا، لیکن جن لوازمات کا ذکر ایرانی شاعری میں ملتا ہے وہ بے شک وہیں سے مخصوص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شراب

اور نشہ کی کیفیات کے مضامین تو ہندوستان کی قدیم زبانوں کے شعروادب میں بھی ملجاتے ہیں لیکن ان لوازمات کی تفصیل نہیں ملتی۔

بہرحال اُردو شاعری کی تاریخ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے لے کر آج تک ذکر شراب غزل کا ایک موضوع رہا ہے، یہاں تک کہ حقیقت و معرفت کے اظہار کے لئے بھی "بادہ وساغر" کے بغیر بات نہیں بنتی نظر آتی، پھر یہ شراب کہیں شراب دو آتشہ ہے اور کہیں شراب معرفت الٰہی اور کہیں مجاز اور حقیقت دونوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ یہاں ایک مرتبہ ہمیں پھر میر تقی میر کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس امر کے لئے ہمارے پاس کوئی یقینی شہادت نہیں کہ انہوں نے واقعی شراب نوشی کی ہو، تاہم ایسے مضامین ان کے یہاں بکثرت ہیں جن میں نشہ کی مختلف کیفیات کا بیان ہے اور اس کے ساتھ شراب معرفت کا ذکر بھی موجود ہے۔ مرزا غالب کی بادہ نوشی کا اعتراف خود ان کے مکاتیب میں ملتا ہے اور ان کا کلام اس کی مزید تشریح اور تفسیر ہے۔ متاخرین میں ریاض اور جگر نے تو ان مضامین کو اپنے کلام میں ایسا رنگ دیا ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں انھیں وہی مرتبہ حاصل ہونا چاہیئے جو فارسی میں عمر خیام کو نصیب ہے۔

جرأت کے متعلق یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ شراب پیتے تھے، لیکن جن غزلوں میں انھوں نے اپنی گزشتہ صحبتوں کو یاد کیا ہے اُن میں شراب نوشی کا ذکر ضرور موجود ہے۔ اگرچہ ایسے اشعار تعداد میں کم اور بالعموم کچھ رسمی سے ہیں لیکن ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جام مے کی نہیں اب ہمکو طلب اے ساقی — بس تری آنکھ دکھانے ہی نے بیہوش کیا

مت شیخ جی چھڑاؤ تم دختِ رز کو مجھ سے — دیکھو نہ پاؤ گے پھر داما داس طرح کا

اب بھی ساقیِ گل اندام ہمیں بھول گیا
سبکو بھر بھر کے دئے جام ہمیں بھول گیا

ہمیں پیمانہ تب دیگا یہ ساقی
کہ جام عمر جب معمور ہوگا

اس بت نے شب کو چاک نشہ میں کیا ہو آپ
زنار کھینچے اپنے گریباں کے تار کے

لبِ ساغر سے ملامت لبِ گلگوں اپنا
غنچہ ساں رشک سے کبتک میں پیوں خون اپنا

شیخ جواں ہوگا تو پی دیکھ اسے
شیشہ میں پانی ہے کرامات کا

بعد مرنے کے بھی ہم مستوں کی ہے یہ آرزو
قبر پر ابر جو ہو تو ہو نہالِ تاک کا

ہمیں نت کنجِ غم میں جس کے غم سے خونِ دل پینا
اسے بزم طرب میں مشغلہ ہے بادہ خواری کا

ہوں وہ کیفی کہ اٹھوں یاں سے تو مر کر ہی ہٹوں
جیتے جی اپنا اُٹھے گا نہ خرابات سے دل

اس قسم کے اشعار دیوان میں اور بھی موجود ہیں لیکن ان میں اُن کیفیات کا پتہ نہیں جن سے کلام میں گرمی پیدا ہو اور نہ ان میں بادہ و ساغر کے وہ استعارے ہیں جو ہمیں مئے رنگوانی کی جگہ شراب معرفت کیطرف لے جائیں۔ بعض اشعار ایسے ضرور ہیں جن میں شیخ اور زاہد پر طنز یا پھبتی ہے اور یہ بھی اسی سلسلے کا ایک رسمی مضمون ہے

اس تبصرہ سے جرأت کی عشقیہ شاعری کے بارے میں آسانی سے رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ ان کا شمار صفِ اوّل کے غزل گو شعرا میں ہونا چاہیئے لیکن ان کے یہاں بھی وہ تمام عیوب کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں جو دوسرے غزل گو شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں مثلاً عجیب و غریب ردیف اور قوافی کے استعمال سے اکثر غزلوں میں صوتی اعتبار سے ایک بے ہنگم کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو سماعت پر بار گزرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو شاعری ایک ایسے دور سے

ضروری ہے جب مشکل ردیف اور قوافی میں طویل غزلیں کہنے سے ہی اظہار کمال ہوتا تھا لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ یہ کمال ممکن ہے زبان دانی یا لسانی مہارت سے قابل اعتنا ہو۔ خالص شاعری اور فن کے نقطۂ نگاہ سے کبھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا، مثلاً

بن تمہارے یہ دل دیوانہ گریباں کو پھاڑ　　　ہر طرف دیکھے ہے کیا دیدۂ حیراں کو پھاڑ

دس شعر کی غزل اس زمین میں جرأت کہہ کر مطمئن نہیں ہوتے، مقطع میں فرماتے ہیں :-

کہہ غزل اور وہ جرأت کہ جسے سن کر لوگ　　　پھینکیں ہر شاعر مضبوط کے دیوان کو پھاڑ

ایک اور غزل کا مطلع ہے :-

پڑ گئے یوں مری آہوں سے جگر میں سوراخ　　　تختۂ چوب میں جوں ڈالدیں برمیں سوراخ

اس میں نظر میں سوراخ، در میں سوراخ، سر میں سوراخ، گھر میں سوراخ، بر میں سوراخ، قمر میں سوراخ کے قوافی موجود ہیں۔ ظاہر ہے ان میں سے اکثر قوافی کی رعایت سے مضمون پیدا کرنے کی کوشش نے شاعر کو شاعری کی بجائے صنعت گری کی طرف متوجہ کر دیا ہوگا اور اخر آفرینی کی جگہ ایک مضحکہ خیز صنعت نے لے لی ہوگی۔

اگر مشکل ردیف مفرد ہو تب بھی شاعر کی صلاحیتیں بروئے کار آنے سے رک جاتی ہیں۔ لیکن اگر لمبی ردیفیں اختیار کر لی جائیں تو کیا صورت ہوگی۔ اس کا اندازہ ایک غزل کے ان چند اشعار سے ہو سکتا ہے :-

یوں خار الم کا ہے دل تنگ میں کیڑا　　　لگ جاتے ہے جوں غنچۂ خوش رنگ میں کیڑا
ہیں اب کے زمانے کے سوار ایسے کہ سب نے　　　خوگیر کے بھرنے میں لگا تنگ میں کیڑا
پیکار ہیں کرم تلک بھی کہ بخواہش　　　پہنچے دہن مرغ خوش آہنگ میں کیڑا
کس زور پہ تھا یہ سر پر شور نہ خاک　　　پوچھے تھا یہ گھس کر سر ہو سنگ میں کیڑا

جب لشکر گریا کی چڑھائی ہو شب روز   دل کے لگے کیوں نہ پھر اور رنگ میں کیڑا

لیکن یہاں بھی جرأت صرف ایک غزل لکھ کر مطمئن نہیں ہوتے

مانند کٹاری کے بڑھا اور بھی جرأت   تو زور سے اس قافیۂ تنگ میں کیڑا

اس کے بعد جو غزل کہی ہے اس میں اثر رنگ میں کیڑا، قدرح ہنگ میں کیڑا، رنگ میں کیڑا، ڈھنگ میں کیڑا سب کچھ موجود ہے اور یہ اشعار جو سرزمین شعر کے حشرات الارض کہے جا سکتے ہیں شاعری کی روح سے بہت دور ہیں۔

ایسے ردیف اور قوافی سے قطع نظر بھی ہر شاعر کے کلام میں کسی نہ کسی قدر رطب و یابس ضرور ہوتا ہے۔ میر تقی خدائے سخن ہیں لیکن ان کے کلام میں بھی ایسی ناہمواری ہے کہ ناقدین کو کھٹکتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جو تو تھا ان کے کلام کو پڑھ کر ان سے وابستہ ہوتی ہیں بعض اشعار کی وجہ منقطع ہو جاتی ہیں۔ آزردہ کا قول کہ بلندش بسیار بلند و پستش بغایت پست کم از کم اس حد تک ضرور درست ہے کہ پست اشعار کی خاصی تعداد ان کے کلام میں موجود ہے۔ یہ پستی مضمون اور بیان دونوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مضمون ہی پوچ ہو اور فنکار اپنی انتہائی کوشش سے بھی اس پر پردہ نہ ڈال سکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فی نفسہٖ مضمون میں کوئی خاص پستی نہ ہو لیکن انداز بیان پوچ، عامیانہ، سوقیانہ یا غیر شاعرانہ ہو جائے، ایسی صورت میں مضمون کی خوبی سے بیان کی خامی کی تلافی نہیں کی جا سکتی مثلاً

آمد و رفت سے ہے سانس کی سینہ مجروح   کاش چھاتی پہ عوض اسکے اک آرا ہوتا

راہ چلتے نقد دل کو لے گیا ایک سیم بر   ڈھونڈیں کیا رستہ میں اپنی گانٹھ کا زر کھل گیا

جا بھڑا ہے نگہ یار سے دل دیکھو کوئی   کیسے شاہیں سے لڑتا ہے کبوتر اپنا

کہتے ہیں جسکو اہل جہاں نخچہ قضا   جاروب کش ہے سو وہ تری قتل گاہ کا

مری لاش پر اس کو مت لائیو عزیزو وہ ہے طفل ڈر جائے گا
دیکھو دز دیدہ نگہ سے تو نکلکر اک رات چور سا کوئی کھڑا ہے پس دیوار لگا

اِن اشعار میں بالعموم رعایت لفظی کے سوا اور کچھ نہیں۔ رعایت لفظی اگر غیر محسوس اور غیرارادی ہو تو اس سے شعر کے لطف میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن بالالتزام رعایت لفظی سے شعر بے مزہ ہو جاتا ہے۔ امانت لکھنوی اس فن کے امام ہیں۔ ان کی اندرسبھا کو دیکھ کر قوت ایجاد اور اُپج کے بارہ میں کسی کو شبہ نہ ہوگا لیکن اس رعایت لفظی کے شوق نے ان کے کلام کے اکثر حصہ کو شاعرانہ اعتبار سے گرا دیا اور ان کا شمار محض دوسرے درجہ کے شاعروں میں کیا جانے لگا، جرأت کے یہاں یہ مرض شوق کی حد تک ہے جو امانت کے یہاں جنوں کے درجہ کو پہنچ گیا ہے۔

جرأت کی عشقیہ شاعری کے بارہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے آپکی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کچھ متفرق کلام ہے جسمیں ایک مثنوی بھی ہو لیکن جرأت کی شہرت کا دارومدار صرف ان کی عشقیہ شاعری پر ہو جس میں انھوں نے اپنا ایک علیحدہ رنگ اختیار کیا ہے۔ یہ رنگ فاسقانہ یا فاحشانہ ہونے کے باوجود اصلیت اور واقعیت سے اتنا قریب ہو کہ اس میں ایک ایسا حُسن پیدا ہو گیا ہے جو صرف اعلیٰ درجہ کی شاعری ہی میں ملتا ہے اور اسی لئے اگر انھیں میر اور مصحفی کے بعد صفِ اوّل کے غزل گو شعرا میں شمار کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

اِنتخابِ کلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نالۂ موزوں سے مصرعہ آہ کا چسپاں ہوا
زور یہ پر درد اپنا مطلعِ دیواں ہوا

جس نے دیکھا آکے یہ آئینہ خانہ دہر کا
فی الحقیقت بس وہ اپنا آپ ہی حیراں ہوا

ہم پہ ظاہر ہو گئی بینائی دل شکلِ برق
وہ بھبوکا اپنی نظروں سی جو تک پنہاں ہوا

اسکے جانے سے یہ دلمیں آرزو رہ رہ کے ہائے
سب جہاں بستا ہے اک اپنا ہی گھر ویراں ہوا

کاش دل سے چشم تک آنے نہ پاتا طفلِ اشک
رفتہ رفتہ اب تو یہ لڑکا کوئی طوفاں ہوا

گر ہوئے وا اس کے لب تو دیکھئے کیا گل کھلے
ہو خفا جب بے طرح وہ رونقِ بستاں ہوا

آئے جو مرقد پہ میرے ہو مکدر پھر گئے
خاک ہو کر بھی غبارِ خاطرِ یاراں ہوا

گرچہ ہر قالب میں جزآت صورتیں ڈھلتی رہیں
پر بنا جو درد کا پتلا وہی انساں ہوا

محمد ہی ہے ممدوحِ ذاتِ کبریائی کا
کہے بندہ گر اس کی مدح دعویٰ ہو خدائی کا

سپہرِ معرفت حقا ہے وہ مہرِ الوہیت
کہ جس کا دین روشن آئینہ ہو حق نمائی کا

بلند اس کا وہ ایوانِ مراتب ہے، نہیں اس جا
خیالِ ساکنانِ عرش کو یارا رسائی کا

منور کیوں نہ اسکے نور سے ہو خانۂ طاعت
کہ روشن کرنیوالا ہے وہ شمعِ پارسائی کا

گروہِ انبیا میں وہ ہی حق کا برگزیدہ ہے سوا اس کے لقب کسکو ملا ہے مصطفائی کا
رکھے ہے منزلت یہ آستانِ سرورِ عالم کہ فخرِ سلطنت ہے مرتبہ واں کی گدائی کا
دلیل اس کی ہے یکتائی کہ بے لاریب اے جرأت
کہ تھا سایہ نہ اس محبوب ذاتِ کبریائی کا

اک جام سے حل کر دے جو عقدہ دو جہاں کا
ہوں مستِ مئے عشق میں اس پیرِ مغاں کا
ہے مبدۂ فیاض کو بھی فیض اسی سے
ظاہر ہے کہ آگہ ہے وہ اسرارِ نہاں کا
تا اس گل گلزارِ حقیقت کے کہے وصف
ہر برگ ہے اپنے لئے ہم شکل زباں کا
جو کہئے سو لاریب علی نام خدا ہے
یارا ہے کسے اُس کے مراتب کے بیاں کا
اس مہرِ ولایت سے جو ذرّہ بھی رکھے بغض
مردُودِ دو عالم ہو وہ یہاں کا نہ وہاں کا
چودہ ہیں طبق چار دہ معصُوم سے قائم
ہر ایک انھوں میں سے ہے سرورِ دو جہاں کا
گر ہوتی نہ ذات اسکی تو جرأت یہ یقین جان
ہوتا کوئی مالک نہ زمیں کا نہ زماں کا

کوئی دنیا میں ظالم کیا نہ ہوگا پرائے بیداد گر تجھ سا نہ ہوگا

ترا دل سنگ دل دیکھا میں ایسا   کسی کافر کا دل ایسا نہ ہوگا
کرے گا گر زیادہ مجھ کو بے تاب   تو اس میں اور تو رسوا نہ ہوگا
ہوا جب بات کرنا ترک بالکل   تو کیا اس بات کا چرچا نہ ہوگا

نہ کھو جرأت کہ اپنے ہاتھ سے جان
کہ ایسا شخص پھر پیدا نہ ہوگا

دل کے لگ جاتے ہی جی تن سے ہمارے نکلا   جی لگانے کا تھا ارمان سو بارے نکلا
ہجر کی رات وہ کافر ہو کہ جوں چشم بلا   آہ تارا بھی ہر اک آنکھ لپارے نکلا
کیا کہیں وصل ہوئے پر بھی زباں سے اپنی   حرف مطلب نہ کوئی خوف کے مارے نکلا

کیا کہیں دل کی طپش جب خفگی میں جرأت
پاس سے ہو کے کبھو کا وہ ہمارے نکلا

خالی اس سے جو ہم نے گھر دیکھا   ہر طرف آہ آہ بھر دیکھا
شمع ساں جس نے کی زبان دراز   اس کا قصہ ہی مختصر دیکھا
دم بدم یہاں نیا ہی عالم ہے   خوب عالم کو غور کر دیکھا
اک نہ ایک بات کا ہے سب کو فکر   اس سے خالی نہ کوئی بشر دیکھا
جس نے اس سادہ رو کو اپنے حضور   ق   سادگی سے بھی بھر نظر دیکھا
دل میں کس کس طرح کا آیا جنوں   کیا یہ سمجھا تھا کیوں ادھر دیکھا
کیا کہیں کیا ترے مریض کا حال   ق   ہم نے اے شوخ بے خبر دیکھا
کل پرستار اس کے تھے جو لوگ   آج ان سب کو نوحہ گر دیکھا
پڑھ غزل اور بھی ایک اے جرأت   فکر میں تجھ کو بیشتر دیکھا

میں وہ طوفانِ چشم تر دیکھا
ابر تر کو بھی جس سے تر دیکھا
موت ہی اب تو زیست ہو کہ بہت
دردِ دل کا علاج کر دیکھا
منزلِ بے خودی میں آپ کو بھی
ہم نے اپنا نہ ہم سفر دیکھا
ہمیں ملک عدم سے ہستی میں
کیا تماشا نہ آن کر دیکھا
جیتے جی مرگ کی بھی لذت کو
خوب دیکھا کہ تجھ پہ مَر دیکھا

دَرد کی طرح جان جُراءت کو
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

خبر ہے تجھ کو دیوانا ہو وہ ای بیخبر کس کا
کہے ہے دیکھکر جو اپنے گھر کو ہے یہ گھر کس کا
قدم جبتک اُٹھاؤں قافلہ منزل کو جا پہنچے
بھلا پھر ناتواں مجھ سا ہو یارو ہمسفر کس کا

ابرِ غم سے چشم گریاں جب برس کر کھل گیا
رازِ سربستہ ہمارا آہ سب پر کھل گیا
ناتوانی سے نہ پایا جب مجھے صیاد نے
بول اٹھا ہے ہے قفس کا کس طرح در کھل گیا
پھر وہیں صیاد نے رشتہ کے تئیں محکم کیا
بے قراری میں مرا گر ایک بھی پر کھل گیا
سب سے پہلے عشق کے دریا میں چلتے ہی ہوا
وائے قسمت اپنی ہی کشتی کا لنگر کھل گیا

عقدۂ دل اپنا لے جا اس یداللہ کے حضور
جسکی ایک انگلی سے جراءت بابِ خیبر کھل گیا

ہوا ہے اب تو نقشہ یہ ترے بیمارِ ہجراں کا
کہ جینے کھول کر موُنھ اس کا دیکھا بس وہیں ڈھانکا

قفس میں ہم صفیرو کچھ تو مجھ سے بات کر جاؤ
بھلا میں بھی کبھی تو رہنے والا تھا گلستاں کا

بجائے اشک ہی خونناب لختِ دل ہی مژگاں پہ
عجب کچھ رنگ ڈھنگ اب تو بنا ہے چشمِ گریاں کا

دلِ مجروح سینے میں کرے ہے سخت بیتابی
اب اس گھائل کا ٹوٹا آہ پھر شاید کوئی ٹانکا

نیستانِ سخن میں کون جرأت کے مقابل ہو
یہ زور اس کے تئیں بخشا ہوا ہے شیرِ یزداں کا

مت یہ گھبرا کر کہو اب یاں سے بندہ جائیگا ۔۔۔ کوئی مر جائیگا صاحب آپ کا کیا جائے گا
یاد کیا آتا ہے وہ میرا لگے جانا اور آہ ۔۔۔ پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آ جائیگا
لے چلے ہیں لوگ کہو لانے عبث احوالِ دل ۔۔۔ رو برو اس شوخ کے کب مجھ سے بولا جائیگا
لوگ کہتے ہیں جو وہ بیزار ہے تو پھر نہ بول ۔ ق ۔ تیرے کچھ رہنے سے کچھ اک وضع پر آ جائیگا
لیک سچ تو یہ ہے وہ روٹھے تو روٹھے مجھ سے پر ۔۔۔ دل مرے بس میں نہیں مجھ سے نہ روٹھا جائیگا

مت بلاؤ بزم میں جرأت کو ہے آتش زباں
آگ سی سب کے دلوں میں آ کے بھڑکا جائیگا

جس گلستاں میں آ کے وہ رشکِ چمن گیا ۔۔۔ اُس کا ہوا یہ رنگ کہ صحرا سا بن گیا
وحشی کے تیرے اسلئے باندھے کفن میں ہاتھ ۔۔۔ یعنی نہ بعدِ مرگ بھی دیوانہ پن گیا

اب ہم ہیں اور شامِ غریبی کی دید ہے — مدت سے وہ نظارۂ صبحِ وطن گیا
یارو جہاں میں اب کہیں دیکھی وفا کی چال — جانے دو یہ نہ ذکر کرو وہ چلن گیا
کل اس صنم کے کوچہ سے نکلا جو شیخِ وقت — کہتے تھے سب ادھر سے عجب برہمن گیا

حیراں ہے تجھ کو دیکھ کے جرأتؔ مری تو عقل
دو چار دن میں کیا یہ ترا حال بن گیا

دل پر لگا اُلٹ کے وہ ہیں تیر آہ کا — جو یاد آ گیا وہ پلٹنا نگاہ کا
تشبیہ کس مزے سے ہیں لذت کو اسکی دوں — کچھ دل ہی جانتا ہے مزہ دل کی چاہ کا
امیدِ مغفرت پہ تو نازاں ہیں ہم ولے — اس کو ہے کب خیال ہماری گناہ کا
سوتا ہوں غافلوں کی طرح جاگتے ہیں میں — از بس کہ محو ہوں کسی غفلت پناہ کا

جرأتؔ جوابِ میرؔ تو ایسا ہی کہہ اب
چاروں طرف سے شور اُٹھے واہ واہ کا

پُوچھو نہ کچھ سبب مرے حال تباہ کا — اُلفت کا ہے ثمر یہ نتیجہ ہے چاہ کا
بولا وہ سن کے سوز مری آہ آہ کا — مشتاق یہاں نہیں کوئی ایسوں کی چاہ کا
تیرے مریضِ غم کی زباں پر نہیں کچھ اور — اک تار بندھ گیا ہے مگر آہ آہ کا

آوارہ در بدر ہوں میں جرأتؔ بقول میرؔ
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

جو دم لب پہ گھبرا کے آنے لگا — تو شاید مرا دل ٹھکانے لگا
اسے رحم جب مجھ پہ آنے لگا — تو صحبت ہی گر وہ دل چھپانے لگا

کسی نے جو پوچھا خفا کس سے ہو — اشارت سے مجھ کو بتانے لگا
میں رو کر جو کہنے لگا درد دل — وہ منہ پھیر کر مسکرانے لگا
دیا اس کے جو در پہ جبراً ہم نے جی
تو الحمد للہ ٹھکانے لگا

نیند بھی اڑ گئی یا رب یہ ہوا مجھکو کیا — میں تو حیراں ہوں کہ یہ روگ لگا مجھکو کیا
درد دل سنکے وہ بولا مرے بھاویں ہی نہیں — کہ برا حال ہے تیرا تو بھلا مجھکو کیا
میں تو کہتا ہوں نہ جا کوچۂ قاتل میں دلا
اور بن آئے مرا چاہے تو جا مجھ کو کیا

سینے کے زخم سے جو ہیں پھاہا سرک گیا
دل آبلہ سا آنکھوں کے آگے جھلک گیا
گلشن میں اس سے روٹھ کے جب ہم چلے تو آہ
دامن سے خار بھی نہ اک آکر اٹک گیا
آنکھوں کے آگے اس کے تصور میں رات کو
سو بار ایک چاند سا آکر جھمک گیا

دم آخر مری بالیں پہ آؤ گے تو کیا ہوگا — میاں صاحب جو دو آنسو بہاؤ گے تو کیا ہوگا
ابھی باتیں ہی ہیں اور دست و پا کھچے ہیں مرے یارو — یہ مضطر کا ہی جب اس گلرو کو لاؤ گے تو کیا ہوگا
ہوا اس بات سے پر حضرت دل مجھکو اندیشہ
ابھی تو اور کچھ ایذا اٹھاؤ گے تو کیا ہوگا

آرام نہ ہو دل کو تو لے یار کریں کیا — پھر پھر کے یہیں آتے ہیں ناچار کریں کیا
صیاد نہ کر منع کہ گلشن کی ہوس میں — تڑپیں نہ یہ تو مرغ گرفتار کریں کیا
احوال کہے بن نہیں بنتی ہے کسی طرح — اور کہیے تو ہوتا ہے وہ بیزار کریں کیا

جہاں کچھ درد کا مذکور ہوگا — ہمارا شعر بھی مذکور ہوگا
جہاں میں حسن پردودن کے اے گل — کوئی تجھ سا بھی کم مغرور ہوگا
مجھے کل خاک افشاں دیکھ بولا — یہی عشاق کا دستور ہوگا
وہی سمجھے گا میرے زخمِ دل کو — جگر پر جس کے اک ناسور ہوگا

کیوں اٹھ چلا جہاں سے دلِ زار کیا ہوا — بیٹھے بٹھائے تجھ کو یہ آزار کیا ہوا
صیاد ٹک قفس کی خبر لیجیو شتاب — ہے کیوں خموش مرغ گرفتار کیا ہوا
ٹک ور تک اپنے آکے اسیروں کی لے خبر — یہ شور سا ترے پسِ دیوار کیا ہوا

بتلا تو دے کہ میں نے کہا تجھ کو کیا بھلا — کہتا پھرے ہے مجھ کو جو تو یوں برا بھلا
بولا یہ نبض دیکھ کے میری طبیب آہ — ایسے مریض کی میں کروں کیا دوا بھلا
جاتا ہوں اپنے گھر کو جو میں اس سے روٹھ کر — کہتا ہے کس ادا سے وہ دیکھیں تو جا بھلا

نہ جواب لے کے قاصد جو پھرا شتاب الٹا
میں زمیں پہ ہاتھ مارا بصد اضطراب الٹا
دم وصل اُسنے رخ سے جو نہ ٹک نقاب الٹا
ہمیں لگ گیا دم اس دم بصد اضطراب الٹا

ترے دور میں ہوئے کش کوئی کیا فلک کہ تیری
وہ ہے شکل جوں دھرا ہو قدحِ شراب اُلٹا
یہ وفا کی ہیں نے لیں پہ مجھے کہتے بیوفا ہو
مری بندگی ہے صاحب یہ ملا خطاب اُلٹا
کسی نسخہ میں پڑھے تھا وہ مقام دلنوازی
مجھے آتے جوں ہی دیکھا ورقِ کتاب اُلٹا

میں تڑپ کے سنگ تربت بصد اضطراب اُلٹا
مری قبر تک جو آکے وہ پھر اشتاب اُلٹا
مرے سو سوال سُن کر وہ رہا خموش بیٹھا
نہ کیا کلام سیدھا نہ دیا جواب اُلٹا
شبِ وصل میں قلق تھا یہ وہ سو گیا تو منہ سے
نہ ذرا بھی یوں دوپٹہ سببِ حجاب اُلٹا
طلب اس سے کل جو مے کی تو بھرا ہوا زمیں پر
مجھے شوخ نے دکھا کر قدحِ شراب اُلٹا
کسی تذکرہ میں پڑھنے مرے شعر جو لگا وہ
تو ہوا نے وہیں حیرت ورقِ کتاب اُلٹا

زباں پر نہ جو حرفِ غم لائے گا
تو گھٹ گھٹ کے اک روز مر جائے گا
کھچا ہاتھ جب تجھ سے لے قیدِ ہستی
فراغت سے پھر پاؤں پھیلائے گا
سمجھتے نہیں دل دہی کا نتیجہ
کہ دن رات سینہ کو سہلائے گا

نہ عاشق کسی پر ہو اے حضرت دل
نہیں آپ اپنا کیا پائیے گا

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چنپئی رنگ اور بدن اس کا وہ گدرایا ہوا
بات ہی اوّل تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی
اور جو بولے ہے کچھ مُنھ سے تو شرمایا ہوا
نوکِ مژگاں پر دلِ پژمردہ ہے یوں سرنگوں
شاخ سے جھک آئے ہے جوں پھول مُرجھایا ہوا

شکوہ کیا کیجیے ناتوانی کا
کھو دیا لُطف زندگانی کا
صبح پیری کا گر نہ ہوتا خوف
تب مزہ تھا شب جوانی کا
لطف کرتے ہی دلکو چھین لیا
زور یہ ڈھب ہے مہربانی کا
کہتے کہتے فسانہ جب سویا
ذکر میں اپنی خستہ جانی کا
سنتے ہی بول اٹھا وہ عیارا
پھر سرا کہیئے اس کہانی کا

دل کیوں کے ہو نہ مائل اس شوخ دِل رُبا کا
دیکھا ہے ہم نے اس میں اک پرتو خدا کا
صحرا کے بیچ رہتا کیوں کارواں سے چُھٹ کر
گر آج کوئی ہوتا مجھ سے شکستہ پا کا

کیوں نہ ہوں حیراں تری ہر بات کا
حسن مرقع کا ہے طلسمات کا

اٹھتی جوانی جو ہے تو دن یہ دلِ
اور ہی عالم ہے کچھ اس گات کا

گھر بلایا ہے تو کچھ منھ سے تو دو
سیکھ یہ ڈھب ہم سے مدارات کا

حکم ہوا رات کو آؤ نہ یہاں
دن کو رکھو طور ملاقات کا

دیکھیو اس کے ذرا آنکھ لڑانے کا مزا
چتونوں میں ہے بھرا سارے زمانے کا مزہ

لذّت وصل کوئی پوچھے تو پی جاتا ہوں
کہہ کے ہونٹوں میں یہی ہونٹ ملانیکا مزہ

اُلفت سے ہو خاک ہم کو لہنا
قسمت میں تو ہے عذاب سہنا

منہ چاہتے چاہنے کو یوں ہی
کیا تمنے کہا ہے پھر تو کہنا

اللہ رے سادگی کا عالم
درکار نہیں کچھ اس کو گہنا

کر بند نہ اشک چشم تر کو
بہتر ترے ناسور کا ہے بہنا

قائم رہے کیا عمارت دِل
دُنیا میں تو پڑا ہے ڈہنا

شب گھر جو رہا میرے وہ مہماں
تھا صبح یہ کس ادا سے کہنا

طاقت نہ رہی بدن میں ہے ہے
قربان گیا یہاں کا رہنا

دل نے بھی دیا نہ ساتھ جراءت
کیا دوس کسی کو دیجے لہنا

جو کہیئے ہوگا یہاں رہنا تمہارا
تو کیا کہتے ہیں کیا کہنا تمہارا

گِلا اس سے کیا میں نے جو رو کر
تو بولا ہنس کے وہ کہنا تمہارا

یہ کہتے ہیں کہ گھر میں گر ہمارے کبھی قسمت سے ہو رہنا تمہارا
تو پھر اس وقت ہمکو قول دے کر کہو مانیں گے ہم کہنا تمہارا
دل آیا جس پہ وہ آیا نہ پاس
میاں جرأت برا لہنا تمہارا

پابوس میسر ہمیں ہیہات نہیں اب وہ چوری چھپے کی بھی ملاقات نہیں اب
نہ خط و کتابت ہے نہ پیغام زبانی اس دل کی تسلی کی کوئی بات نہیں اب
جس چین سی گزریں کئی راتیں سو کہاں اب دن زیست کے کٹتے ہیں ڈاوقات نہیں اب
خوش چسپ تو ہزاروں ہیں پر ان میں تو کافر حق یہ ہے کہ اُس سی تو کوئی گات نہیں اب
باطن میں وہی لاگ ہے آپس میں اگرچہ جا سو سو نئے خطرے سو ملاقات نہیں اب

کچھ جو محفل میں چلی اس بت خونخوار کی بات
گزری اس وقت سو کیا کہیئے دل زار کی بات
اس کا کیا حال کہوں اب تو یہ حالت ہے کہ آہ
کچھ بھی سمجھی نہیں جاتی ترے بیمار کی بات

بلبل سُنے نہ کیوں کے قفس میں چمن کی بات
آوارۂ وطن کو لگے خوش وطن کی بات
ہے موسم بہار میں باصد زباں خموش
غنچہ نے کیا سنی ہے کسی کے دہن کی بات

عیش و طرب کا ذکر کروں کیا میں دوستو
مجھ غم زدہ سے پوچھئے رنج و محن کی بات
سر دیجے راہِ عشق میں پر مُنہ نہ موڑیئے
پتھر کی سی لکیر ہے یہ کوہکن کی بات
جرأت خزاں سے آہ چمن میں نہ کچھ رہا
اک رہ گئی زبان پر گل اور سمن کی بات

جز بیکسی و یاس نہیں ہے کوئی جس جا — ہے اپنی وہ تربت
افسوس کرے کون بجز دستِ تمنّا — ہوں کشتۂ حیرت
جو میں نے کہا اس سے دکھا مجھکو رُخ اپنا — بس دے نہ اذیّت
تو کیا کہوں کس شکل سے جھنجھلا کے وہ بولا — تو دیکھے گا صُورت
یہ راہ تکی اسکی کہ بس چھا گئی اک بار — آنکھوں پہ سپیدی
پیماں گسل آیا نہ وہ دے وعدۂ فردا — تا صبحِ قیامت
سودائے محبت جو نہیں ہے تجھے اے دِل — تو پھر مجھے بتلا
کیوں چاک کئے اپنا گریباں ہے پھرتا — آنکھوں پہ ہے وحشت
اب گھر میں بُلا لیتے اگر آتے ہیں سو سوچ — بد نام سمجھ کر
آوارہ ہی در پر مجھے تو آ کے سُنا جا — از راہِ مُروّت
یا مجھکو بُلا لاتا تھا یا وہ آئے تھا مجھ پاس — صحبت کی تھی گرمی
اب اسکو خدا جانے دیا کس نے یہ کھٹکا — جو ایسی ہے نفرت
لے نام مرا کوئی تو دے سیکڑوں دشنام — گن گن کے وہ قاتل

بے رحمی و بیدردی سے پروا نہ ہو اصلا   سن مرگ کی حالت
آنا مرا سن در پہ کہیں گھر سے چلا جائے   دیکھوں تو نہ دیکھے
اور کوئی سفارش کرے میری تو کہوں کیا   کیا کھینچے ندامت
افسوس کہ گردوں نے عجب رنگ دکھایا   نقشہ ہی وہ بدلا
کس منہ سے کروں عشوہ گری اسکی بیاں میں   اللہ رے ادائیں
مل بیٹھے ہم اور وہ کہیں قسمت سے جو یکجا   طرفہ ہوئی صحبت
بیتاب ہو اک چلنے کا جو میں نے کیا عزم   دے بیٹھا وہ گالی
کچھ اور کیا قصد تو کیا ناز سے بولا   بل بے تری جرأت

آیا نہ اس کے وصل کا گر کچھ پیام آج   تو اضطراب دل نے کیا بس تمام آج
فردا ہی یاں سے کوچ بس اب ہمنے شب کی شب   جوں شبنم اس چمن میں کیا ہے مقام آج
تھا مضطرب جو مرغ گرفتار کل تلک سے آج   جنبش ذرا بھی اس کو نہیں زیر دام آج
اے بے خبر خبر تجھے لینی ضرور ہے   شاید ترا مریض ہوا ہے تمام آج

کل تم نہ تھے تو رات تھی پیارے بلا طویل   اب ہو تو دیکھیو دم میں سحر ہے آج
ٹک منہ ادھر کو کیجیو قربان جاؤں ہائے   کیا ہی بہار نام خدا آپ پر ہے آج

دم دے کے ہمدموں اسے لاؤ کسی طرح   جی واسطے خدا کے بچاؤ کسی طرح
میں جاں بلب ہوں جان تم آؤ کسی طرح   پاس اپنے یا مجھی کو بلاؤ کسی طرح
اظہار دوستی کی قسم لو میں کیا کروں   چھپتی نہیں یہ بات چھپاؤ کسی طرح
رونے سے دل کی آگ بھڑک اور اٹھی ہے آہ   لو تم اب اس لگی کو بجھاؤ کسی طرح

زرا آپ کے تو ہاتھ چڑھا ہے حسین بند — گویا کمند مار و ادا ہے حسین بند
ہیں بانکپن کے ہوں میں تصدق کہ کان میں — بالا ہے اور کلیوں میں پڑا ہے حسین بند
ہو صبح مہر قتل وہ زنجیر دیکھ کر — مہندی کے رنگ میں ہے کھلا ہے حسین بند
ہو چھند بند جس کے بھرے پور پور میں — پہنے وہ خوشبو گر لو بنا ہے حسین بند

قدم یوں رکھے ہے وہ پیارا زمیں پر — پری کا ہو جیسے گزارا زمیں پر
مقام اس کا آخر کو زیر زمیں ہے — پڑا ہے یہ لشکر جو سارا زمیں پر
اِدھر سے زیر زمیں کچھ تو لے جا — کہ آنا نہیں پھر دوبارہ زمیں پر
یہ زیر زمیں سے سنا شور ہم نے — قدم زور سے ٹک جو مارا زمیں پر
کہ غافل نہیں خوب یہ چال چلنا — کبھو اپنا بھی تھا گزارا زمیں پر

حیراں نہ ہو سر دیکھ مرا اپنی زمیں پر — دیکھو تو لکھا کیا ہے مری لوح جبیں پر
اے وائے کہ موسم میں ہم آواز ہمارے — پرواز میں مصروف ہیں اور ہاتے نہیں پر

جاتی ہے میری جان تن زار چھوڑ کر — تو اب کہیں نہ جا مجھے اے یار چھوڑ کر
ہم پا شکستہ کچھ نہ تھے منزل کے کام کے — جاتے رہے اب اس لئے سب یار چھوڑ کر
اے ہم صفیرو آہ تم آزاد ہو چلے — کنج قفس میں مجھ کو گرفتار چھوڑ کر

جو ڈرتے اس بت خونخوار کے ڈرتا ہوں رہ رہ کر — تو کچھ دل میں سمجھ کر بات وہ ہنستا ہے قہقہہ کر
سنے سے قصہ مجنوں کے یہ خاطر میں آتا ہے — یونہی مر جائیں گے ہم بھی جفا و جور سہہ سہہ کر
گریباں چاک کیوں ہوگا گلی غنچہ کو کیوں ہچکی — ہنسا تھا کون گلشن میں لب خنداں تو قہقہہ کر

بتاؤں ہم نفساں کیا میں گلستاں کی خبر　　قفس میں مجھ کو نہیں اپنے آشیاں کی خبر
ترے خیال میں دونوں جہاں سے ہم گزرے　　نہ اُس جہاں کی خبر ہے نہ اِس جہاں کی خبر

اس ڈھب سے کیا کیجے ملاقات کہیں اور　　دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور
گھر اس کو بلا نذر کیا دل تو وہ جرأت　　بولا کہ یہ بس کیجیے مدارات کہیں اور

جب گھر کو وہ چلا کسی بیکس کو مار کر　　کچھ کہتے کہتے رہ گئے سب مونھ پسار کر
ایک آہ سرد کھینچ کے رہ جاتے ہیں ہم آہ　　ق　　دل کو مسوس سینہ پہ ہاتھ اپنے مار کر
کہنا کسی کا یاد جب آتا ہے یہ ہمیں　　اتنا نہ کھینچ کھینچ کے تو مجھ کو پیار کر

ہم اس طرح رہے یارانِ رفتگاں سے دُور　　غریب جیسے کوئی رہ جاوے کارواں سے دُور
بسانِ بلبل دورا ز چمن فتادہ اب آہ　　پڑے تڑپتے ہیں ہم بزم گل رخاں سے دُور
چمن دکھایا نہ صیاد نے کبھو ہم کو　　رکھا قفس کو بھی دیوارِ گلستاں سے دور
ذرا تو بیٹھیے نزدیک گر کہوں اس سے　　تو کس ادا سے وہ کہتا ہے چل یہاں سے دُور
جلا ہی دے گا ابھی مرغ دل کو سوز فراق　　الٰہی رکھیو یہ برق اسکے آشیاں سے دُور
جو پاس پاس چمن میں دکھا رہے تھے بہار　　وہ پہنچے برگِ گل اب صرصرِ خزاں سے دُور

غم بٹانے کو جو بیٹھوں کسی غم خوار کے پاس　　بیقراری یہی کہتی ہے چلیں یار کے پاس
منھ نہ کھلواؤ مرا چپکے رہو جانے دو　　آپ چھپ چھپ کے نہیں جاتے ہو اغیار کے پاس
ہیں الم میں ہوں دلِ زار کو لیجا ظالم　　آہ بیمار کو رکھتے نہیں بیمار کے پاس
ہم اسیرانِ محبت کو چمن سے کیا کام　　ق　　جانے پاویں نہ جب اپنے گلِ بیخار کے پاس

ہاں جو گھبرائے ہے دل بریں تو کاٹ آتے ہیں
چند اوقات کسی مُرغِ گرفتار کے پاس

دل دے چکے ہیں تس پہ بھی حاضر ہے جان تلک
بیرحمی اتنی اے بتِ کافر کہاں تلک

صیاد اسقدر بھی ستم ٹک قفس مرا
لے جا خدا کے واسطے ٹک بوستاں تلک

جوں نقشِ پا جدا ہو رفیقوں سے رہ گئے
پہنچے نہ آہ ضعف سے ہم کارواں تلک

ٹوٹے جو بال و پر تو رہا دام سے ہوئے
ممکن نہیں جو پہنچ سکیں آشیاں تلک

یہ حال دل ہے غم سے لگی ہے جگر کو آگ
جیسے کسی غریب کے لگ جائے گھر کو آگ

ہے تنگ آئے ہیں اُلفت کے پیچ و تاب سے ہم
جو مر مٹیں تو چھٹیں آہ اس عذاب سے ہم

کیا سوال جو مجھ سے کہ کیوں تم آتے ہو
تو کیسے رہ گئے منھ دیکھ لاجواب سے ہم

ثواب ہے یہ جو کہئے کسی کا خوش کرنا
تو کیا کہے ہے کہ باز آئے ہیں ثواب سے ہم

نہوا اک دم کی خاطر سرگراں تم
کہاں یہ بزم اور پیارے کہاں تم

چھپاتے کیوں ہو باتیں ہم سے پیارے
نہ رکھتے تھے کبھی ہم سے نہاں تم

گنہ کیا ہم سے ایسا ہو گیا جو
ہوئے نا مہرباں اے مہرباں تم

مِلایا خاک میں بندوں کو اپنے
نپٹ ہی سنگدل ہو اے بتاں تم

مرے مرنے سے چھوٹا غم تمہارا
کہو رہتے ہو اب تو شادماں تم

جو کچھ باتیں تمھارے دل میں آئیں ہمیں کہتے رہے سوائے میاں تم
نہیں ہے حوصلہ سننے کا باقی اب آگے تھام لو اپنی زباں تم

مثلِ آئینہ باصفا ہیں ہم دیکھنے ہی کے آشنا ہیں ہم
دیکھ سایہ کی طرح اے پیارے ساتھ تیرے ہیں اور جدا ہیں ہم
ٹک تو کر رحم اے بتِ بے رحم آخرش بندۂ خدا ہیں ہم
ظلم پر اور ظلم کرتے ہو اس قدر قابلِ جفا ہیں ہم
ہم بھی کچھ چیز ہیں میاں لیکن یہ نہیں جانتے کہ کیا ہیں ہم

ہے یہ مشکل جو ملیں اس بتِ مغرور سے ہم دو سے تیسرے دیکھ آتے ہیں ٹک دور سے ہم

ہے یہ اس کی نقاب کا عالم ماہ پر جوں سحاب کا عالم
کچھ بھروسا نہیں ہے جینے کا زندگی ہے حباب کا عالم
سارے عالم سے کچھ جدا ہے آہ دلِ خانہ خراب کا عالم
صحبتیں وصل کی کہوں کیا میں تھا وہ گویا کہ خواب کا عالم
دے ہے گالی سوال بوسہ پر دیکھتے ہو جواب کا عالم
سوزِ ہجراں سے دل کا حال ہے یہ آگ پر جوں کباب کا عالم
کیا چمک پر ہے دیکھیو جرأت
اس رخِ پر عتاب کا عالم

بہ دریائے محبت زورق آسا غم کے مارے ہم
کبھی ہیں اس کنارے اور کبھی ہیں اُس کنارے ہم

کہے ہے یوں دلِ مضطر سے اِس بن جانِ غم دیدہ
چلو تم رفتہ رفتہ آتے ہیں پیچھے تمہارے ہم

کئی بار اس نے دیکھا آج چشمِ قہر سے ہم کو
سزاوارِ عقوبت تو ہوئے اے بخت بارے ہم

نہ مانی دل نے اپنی اور نہ ہم نے بات ناصح کی
ہمیں کہہ کہہ کے ہارا وہ اسے کہہ کہہ کے ہارے ہم

وہ جب آئینہ دیکھے ہے تو کیا کیا مسکراتا ہے
سمجھ کر یہ کہ یعنی ہیں قیامت پیارے پیارے ہم

محبت مجھ سے تم رکھتے ہو توبہ — چلو کھاؤ نہ بس جھوٹی قسم تم

خداوندا بحقِ چار دہ معصوم سن لیجو — یہ آنکھیں دیکھیں جرأت ہو یہی امیدواری ہیں
کہ شب کو تو پری رویوں کا مجمع ہووے اور دن کو — پرے فوجیں کھڑے ہوں شاہِ سلیماں کی سواری ہیں

اس سادگی کی ہم تو قربان آن پر ہیں — ایک ہاتھ میں ہے سمرن دو پھول کان پر ہیں
دیکھیں وہ تیغ قاتل کیا کیا کھلائے ہے گل — یہ بیل اور بوٹے جس کی میان پر ہیں
دیکھا اس کو دور سے سب پیر و جواں کہیں ہیں — اب تو لڑائی جھگڑے اس نوجوان پر ہیں
گو وہ نہ بوسہ دیوے لیکن اس آرزو میں — کس کس مزے کی باتیں اپنی زبان پر ہیں
پوچھو نہ ہم صفیرو بیتابیوں سے ہردم — اب آشیاں ہو ہم پر ہم آشیان پر ہیں

ہمراہ قافلہ ہوں رہی جو میں دیوانہ   میرے سبب سے صدمے سب کاروان پر ہیں

دل مفت لے گئے تم جو میں کہا تو بولے   کیا کیجے گا ہمارا ہاں ہم تو مفت بر ہیں

مجھ سے مت پوچھو کہ دمساز کسے کہتے ہیں   میں تو محرم نہیں ہمراز کسے کہتے ہیں
خانہ پرور قفس ہم ہیں اسیر اے صیّاد   تو بتا دے ہمیں پرواز کسے کہتے ہیں

لگ جا گلے سے طاقت اب اے نازنیں نہیں   ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
کیا رک کے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلوں   بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں
فرصت جو پا کے کہیے کبھی دردِ دل سو ہائے   وہ بدگماں کہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں
کیا جانے کیا وہ آئیں ہے لوٹے ہے جس پہ جی   یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں
سُنتا ہے کون کس سے کہوں دردِ بیکسی   ہمدم نہیں ہے کوئی مرا ہم نشیں نہیں

سحر کو بلبلیں کرتی ہیں غل غنچے چٹکتے ہیں   قفس کے ہم در و دیوار سے سر کو پٹکتے ہیں

چشم بد دور یار کی آنکھیں   ہیں قیامت بہار کی آنکھیں
مے کے پینے کا مت کرو اخفا   نہیں چھپتیں خمار کی آنکھیں

ڈر سے موں صیاد کے خاموش میں اے ہم صفیر   کیا قفس میں یاد ہم کو اب چمن آتا نہیں

اپنے تو وہم میں بھی نہیں عنبر کا خیال   تجھ کو خدا نہ کردہ یہ ہوئے گماں کہیں

اے ہم نوا قفس میں اسیروں کو جلنے دے　　کیوں دے ہے فصلِ گل کی خبر آہ تو ہمیں

گرمی مرے کیوں نہ ہو سخن میں　　اک آگ سی پھنک رہی ہے تن میں
ہشیاری میں کب ہے ایسی لذّت　　جو کچھ ہے مزا دیوانہ پن میں
خواری کا مری وہ لطف سمجھے　　کامل جو ہو عاشقی کے فن میں
ناصح میں رفو کی جب کہوں آہ　　حالت ہو جو کچھ بھی پیرہن میں
اے بادِ خزاں وہ کیا ہوئے گل　　خاک اڑنے لگی ہے کیوں چمن میں
بیتابیٔ دل کرے ہے رسوا　　کیا جائیے اس کی انجمن میں

وصل بننے کا کچھ بناؤ نہیں　　واں لگا دل جہاں لگاؤ نہیں
پاؤں کیوں داہنے نہیں دیتے　　گر کسی کا تمھیں دباؤ نہیں
زخمِ دل کا علاج کیا کیجیے　　قابلِ مرہم اپنا گھاؤ نہیں
ایسے دریا میں بہ چلے ہیں کہ آہ　　جس میں پایاب ہے نہ ناؤ نہیں

شب چلی جاتی ہے لیکن آنکھ لگ جاتی نہیں　　دل کی بیتابی سے ساری رات نیند آتی نہیں
غیر کی چھاتی پہ سر دھر کر جو لیٹا ہے وہ شوخ　　دل مرا کیونکر نہ امڈے کیا مری چھاتی نہیں
ہو کے مجبور اب کیا ہے صبر میں نے اختیار　　ورنہ کیا میری قفس میں طبع گھبراتی نہیں

دام میں ہم کو لاتے ہو تم دل اٹکا ہے اور کہیں　　شعر پڑھا ہے ہم سے اور مضمون گٹھا ہے اور کہیں
آنکھیں ذرا ادھر کو ملاؤ کیوں جی یہ کیا باتیں ہیں　　بات کی ہم سے اٹھائی لذّت جی کا مزا ہے اور کہیں
حق تو یہ ہے کچھ حالِ دل اپنا کہتے ہیں جب تم سے ہم　　کان لگائے سنتے ہو پر دھیان لگا ہے اور کہیں

باتیں پہ سب ظاہر کی ہیں اُنس ہوا ہے اور کہیں
تم سا شاید کوئی پیارے تم کو ملا ہو اور کہیں

کاٹیں ہمنے رو رو ساون کی راتیں کالیاں
خود بخود کس کس مزے سے ہمنے چھریاں کھالیاں
اس کے مکھڑے کی بلائیں صبح تک کیا کیا لیاں

نے جو ہمدم تری باتوں کا جواب   مت بُرا مانیو اس وقت میں تھا اور کہیں
س بت بیدرد سے کہیئے تو کہے   جا کے یہ رام کہانی تو سُنا اور کہیں!

کیونکہ اب اس سے ملاقات ہو ایک آن کہیں   دل دیا اس کو کہ آیا تھا جو مہماں کہیں
رات تو بند قبا کھولنے کی ہٹ میں گئی   صبح نزدیک ہے لے اب تو کہا مان کہیں

یں جب دیکھو ہوں جاتے سوئے گلشن ہم صفیروں کو   قفس گلزار ہو جاتا ہے تب ایسا پھڑکتا ہوں

دل لگ گیا ہے اس بُت بے رحم سے مرا   بندہ تو کیا خدا کا بھی کچھ جس کو ڈر نہیں

یہ تمنا ہے کہ بیٹھے ہوں ہم اور تم اک جا   اور وہاں کوئی نہ اپنا ہو نہ بیگانا ہو
حسرتیں جی میں جو کچھ ہیں سو نکالیں باہم   دافعِ شرم و حیا شیشہ و پیمانا ہو

روویے ہر چشم زار زار دیکھئے کیا ہو کیا نہ ہو   اُمڈے ہے اشک بیشمار دیکھئے کیا ہو کیا نہ ہو

باد خزاں چلی ہے اب بلبل زار ہے غضب   ٹھیرے نہ ٹھیرے یہ بہار دیکھئے کیا ہو کیا نہ
غم سے ترے ہے جاں بلب یہ دلِ ناتواں سواب   جیوے نہ جیوے اب لگا دیکھئے کیا ہو کیا نہ

چلا بغل سے مرا دل بھی جی گنوانے کو   رہا نہ کوئی مرے پاس دکھ بٹانے کو
رقیب کو جو بٹھاتے ہو میں سمجھتا ہوں   یہ ساری باتیں ہیں پیارے مرے اٹھانے کو
ذرا تو اپنے اسیروں کی لے خبر صبا   قفس میں کیسے ترستے ہیں آب و دانے کو

دل ہی جس کا عدوئے جانی ہو   کیوں کے پھر اُس کی زندگانی ہو

کشتۂ تیرِ نگہہ تیرا جو اے سفاک ہو   بعد مرنیکے بھی پھر وہ خاک تودہ خاک ہے
یاد کیا آتا ہے وہ اپنے لپٹ جانیکے ساتھ   اس کا ڈر جا کر یہ کہنا تم بھی کیا بیباک ہے

اب دکھایا چاہتے ہیں بیقراری اور کچھ   دم بدم ہونے لگی حالت ہماری اور کچھ
میں تو حیراں ہوں کہ ہوگی کس طرح صحبت برار   خواہش اپنی اور کچھ مرضی تمھاری اور کچھ
یہ مزا پایا کہ اب تک چاٹتا ہوں اپنے ہونٹ   دے لبِ شیریں سے پیارے ایکباری اور کچھ

جی دیا ہم نے تو پہلے ہی ترے ناز کے ساتھ   اپنا انجام ہوا عشق کے آغاز کے ساتھ
ناتواں ہوں میں یہاں تک کہ قفس سے جو چھٹوں   جی نکل جانے مرا پہلی ہی پرواز کے ساتھ

لگ گیا دل تو اب اک پردہ نشیں سے ناگہ   لو مبارک ہو کہ اب ہم تو چھپنے لگے جا کر

یامت کے بھی دن سے ہجر کا دن سخت ہوتا ہے — خداوندا یہ دن مجھ کو نہ دکھلانا نہ دکھلانا
نول سوز جرأت کیا کہیں ہم فکر کو اپنی — ہمارا شعر ہیگا بادۂ وحدت کا پیمانہ
لے جیسا کوئی ہو اسکو ویسا انشا کرتا ہو — زنانے کو زنانہ اور مردانے کو مردانہ

ا جوڑے کی بندش اور قیامت قد وبالا ہو — غضب چتون ستم مکھڑا بدن سانچے میں ڈھالا ہو
ٹھا دے حلقۂ ماتم میں وہ نتھ پہننے والوں کو — کرے سیانوں کو جو بھولا سوان کانوں کا بالا ہو
اسینہ پہ رکھا ہاتھ اور بس چشم بھر آئی — الٰہی اب تلک کیا زخم اپنے دل کا آلا ہو

وہ ہاتھ آئیں تو زانو پہ بٹھائے رکھئے — لب سے لب سینے سے سینے کو ملائے رکھئے
ں میں وہ پردہ نشیں اپنے گر آجائے تو بس — کنج خلوت میں اسے سب سے چھپائے رکھئے
ربخت اپنے جو بیدار ہوں تو آٹھ پہر — کیا ہی لپٹا کے گلے ساتھ سلائے رکھئے

سنا ہے وہ خدا ناکردہ ہے بیمار کیا کیجے — عیادت کو بھی جانا ہو ہمیں دشوار کیا کیجے
بیعت اسکی ماندی اپنے جانیکی منادی ہے — بھلا پھر کس طرح سے جا کے ہوں غمخوار کیا کیجے
یکو بھیج بھی سکتے نہیں احوال پرسی کو — مگر یہ چپکے چپکے کہتے ہیں ہر بار کیا کیجے
یال اس کی طبیعت کو جو گھبرانیکا گزرے ہے — تو کہہ آتے ہیں در پہ گہ پس دیوار کیا کیجے
لب زر کی ہو وہاں اور اپنے تئیں بیماری عسرت — کہاں سے لائیے پھر شربت دینار کیا کیجے

کف افسوس ملتے ہیں کہ جرأت ہم نہیں اس جا
نہیں تلوے تو سہلاتے کھڑے دو چار کیا کیجے

ہاں ہے گل میں صفائی ترے بدن کی سی — بھری سہاگ کی تس پر یہ بو دلہن کی سی

جتاؤں دردِ محبت تو کس ادا سے کہے
کرو نہ مجھ سے یہ باتیں دیوانہ پن کی سی
بس اتنے واسطے مصروف سیرِ باغ ہوں میں
کہ پائی جاتی ہے یہاں بو اس انجمن کی سی
ہزار گل کی کلی میں اگرچہ ہو تنگی
ولے یہ بات کہاں آپ کے دہن کی سی
برنگِ نکہتِ گل بیخودوں کی حالت آہ
ہمیں وطن ہی میں غربت ہے بیوطن کی سی

پتنگ دل کے جو ہاتھوں سو تھامیں جینے سے
ہوئے جُدا نہ موئے پر کبھی ہاتھ سینے سے
اب اسکی بزم ہے جوں بارگاہِ نادرشاہ
کہ سر جھکائے کھڑے چپ ہیں سب قرینے سے
جو کوئی چاہے کہ ہوں بحرِ بیخودی میں غرق
ملا کے عطر کو سونگھے ترے پسینے سے
دماغِ بادہ خوری ہم کو تھا کبھی اب آہ
فراغ کس کو ہے خونِ جگر کے پینے سے
چمک پہ سبزۂ خط سے ہے یوں گل رخسار
بہار جیسے ہو کندن پہ سبز مینے سے

دہانِ شیشہ جلدی کہتے ہیں مے نوش کھلجا تو
مبادا ابر ہے اے ساقیٔ مدہوش کھل جائے
بڑھاپے میں یہ اچھلے سنج جی کل وجد میں آکر
نیا پکڑا ہوا جیسے کوئی خرگوش کھل جائے

بے مروت ہے یار کیا کیجیے
اے دل بے قرار کیا کیجیے
کس طرف جائیے ترے ہاتھوں
گردشِ روزگار کیا کیجیے

ہجر میں جاتا ہے جی کیا کیجیے
سخت گھبراتا ہے جی کیا کیجیے
ان کہے بنتی نہیں کچھ اس سے اور
کہتے شرماتا ہے جی کیا کیجیے
دردِ دل کی اب یہ شدت ہو کہ آہ
دم رکا جاتا ہے جی کیا کیجیے

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم   کہ خدا دیوے نہ جبتک تو سلیماں کب دے

جب کہ ہنسنا بولنا اس شوخ کا یاد آئے ہے   بس وہیں دو دو پہر چٹکی سی کچھ لگ جائے ہے
وہ گلے لگ لگ کے سونا اسکا جب یاد آئے ہے   سینہ کوبی متصل ہے اور زباں پر ہائے ہے
ناصحو مشفق نصیحت اپنی بس تہ کر رکھو   میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

غصہ میں جو کچھ کھینچ کر شمشیر تولے ہے   یہ میرے قتل ہونیکو سر تقدیر تولے ہے
وہ جب کرتا ہے باتیں مجھ سے میں حیران رہتا ہوں   کہ گویا خوبصورت مونھ سے اک تصویر بولے ہے
صبا گلشن میں جو آئی خزاں کی کیا خبر لائی   کوئی پوچھو تو بلبل آج کیوں دلگیر بولے ہے

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے   ہوئے نوکر بھی تو نوّاب محبت خاں کے

گل لائے ہزاروں ہیں شجر اور ثمر بھی   کیجو کرم اے بادِ بہاری ٹک ادھر بھی
اس صید گرفتار کی کیا کہئے کہ صیاد   سونپے ہے قفس میں جسے اور توڑے ہے پر بھی

دلِ وحشی کو خواہش ہے تمھارے در پہ آنے کی   دوانہ ہے ولیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی

کلبۂ احزاں میں ہوں جیتے جی میں اس بغیر   قبر میں مُردا کوئی جیسے کہ سونپا جائے ہے
بیقراری سے کسی صورت سنبھلتا ہی نہیں   دلکو جوں جوں روکتا ہوں میں تو مچلا جائے ہے
ناز کی نظروں میں اسنے جاہ تو حالت مری   یہ ہوئی جیسے کہ کوئی چور پکڑا جائے ہے
دل دیئے مدت ہوئی ہے اب تلک لیکن فلاج   اس بتِ کافر کا کس کافر سے سمجھا جائے ہے

عشق کے صدمے سے ابتو جی رُکا جاتا ہی آہ — ایک پھوڑا ہے کلیجہ پر کہ بڑھتا جائے ہے
کیا کہوں اے ہم نشیں اپنی تو وہ حالت ہوئی — جوں کسی کا قافلہ رستہ میں لوٹا جائے ہے

آخر اس کی بزم سے ہم شمع ساں اُٹھ جائیں گے — صبح تک جلتے ہیں پھر گریہ کناں اُٹھ جائیں گے
ہم بھی اس باغِ جہاں میں شب کی شب مہمان ہیں — مثلِ شبنم صبحکو گریہ کناں اُٹھ جائیں گے

یوں ترے کوچے میں ہم اور دلِ زار ملے
جوں دلِ افگار سے اک تازہ دلِ افگار ملے
جان و دل پرسشِ احوال بہم کرتے ہیں
آہ بیمار سے جیسے کوئی بیمار ملے

غضب طرزِ ستم میرا ستم ایجاد جانے ہو — کہ جسکو فتنۂ ایام بھی اُستاد جانے ہے
کیا آزاد سبکو اک مجھی کو دام میں رکھا — نہیں معلوم خوبی مجھ میں کیا صیاد جانے ہو

پڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری — تو مونھ کو پھیر کے کہتا ہو وہ پناہ تری

کوئی یہاں اسکو لے آوے بُلا کے — بہانے سے کسی اور آشنا کے
بتاں تیغِ تغافل سے نہ مارو — کہ ہیں آگے ہی ہم مارے خدا کے
سلوک عشق ہے یہ شہر دل سے — پڑیں جیسے کسی بستی میں ڈاکے
چلو بخشو گنہ بندے کا صاحب — بٹھاؤ بزم میں اپنی بُلا کے

شبِ فرقت بلا ہی بھاری تھی　　بچ گئے زندگی ہماری تھی
مر گئے ہجرِ یار میں صد شکر　　جیتے رہتے تو سخت خواری تھی

جی جلا دے وہ جس سے لاگ لگے　　غرض اس عاشقی کو آگ لگے
پانو پر ہاتھ میں رکھا تو کہا　　کچھ بہت کرنے تم سہاگ لگے
سن کے جرأت کا وہ فسانۂ غم　　بولا خوش کس کو ایسا راگ لگے
مجھ کو رسوائے خلق کرتا ہے
اب ترے چاہنے کو آگ لگے
